گوشہ ترجمہ:

یاقوت

مصنف:البیرونی/اُردو ترجمہ وحواشی:عطش دُرّانی*

کتاب الجماہر فی معرفتہ الجواہر، محمد بن احمد البیرونی (۳۶۲ھ/۹۷۳ء.....۴۴۰ھ/۱۰۴۸ء کی وہ معرکتہ ال آرا التصنیف ہے جو علم جواہر اور طبعی کیمیا میں آج بھی ایک بے مثل حیثیت رکھتی ہے۔ اس کا عربی متن حیدر آباد دکن سے ۱۳۵۵ھ/۱۹۳۶ء میں شائع ہوا۔اس کا انگریزی ترجمہ حکیم محمد سعید نے کیا تھا جو ہمدرد کونسل اسلام آباد سے ۱۴۱۰ھ/۱۹۸۹ء میں شائع ہوا۔اس کی فصل اوّل کا اُردو ترجمہ اس کی ادبی اور علمی شان اور اہمیت کے حوالے سے شائع ہو چکا ہے۔اب فصل دوم کا باب اول اس کے ادبی، تکنیکی اور تاریخی حوالے سے پیش کیا جارہا ہے۔اس میں یاقوت کے حوالے سے معلومات اور حواشی جمع ہیں۔

تمام جواہر میں یاقوت[۱] (Ruby) کو خوبصورتی اور مقام میں اوّلیت حاصل ہے۔اللہ تعالیٰ نے جنت کی حوروں کو اس سے تشبیہہ دی ہے:

''وہ یاقوت اور مرجان کی مانند ہیں'' (الرحمان ۵۵:۵۸)

یاقوت کی بہترین انواع کئی طرح کی ہیں: سفید، سرمئی، سیاہ، زرد اور سرخ[۲] ان میں سرخ ہی بہترین کہلاتا ہے، کیوں کہ سرمئی اور سیاہ یاقوت چہرے اور جلد کے لیے موزوں نہیں ہوتے۔ایسا شخص جو اس طرح کے رنگ پہنے دم کشیدہ اور مار کھایا ہوا لگتا ہے۔ پیلاہٹ اس شخص سے وابستہ کی جاتی ہے جو کمزور اور خوفزدہ ہو۔

حمزہ بن حسن الاصفہانی کا قول ہے کہ فارس میں یاکند اور یاقوت معرّب نام ہیں۔اہل فارس اسے بسیج (بسیہ) اسمور بھی کہتے ہیں جس کا مطلب دافعِ طاعون ہے یا صرف سیج (سیہ) کہتے ہیں[۳]۔ان مقالوں میں سرخ کی توصیف کے ضمن میں حمزہ کا دیا ہوا نام ہی دہرایا گیا ہے۔ہندوستان کے لوگ اسے ''پدماراک'' کہتے ہیں اور ان کے نزدیک یہ پتھر شفاف اور سرخ ہوتا ہے۔محسوس یہ ہوتا ہے کہ ''راک'' اس کا نام ہے اور ''پدم'' اس کی خاصیت ہے۔ان کی زبان میں سرخ نیلوفر (کنول) پدم کہلاتا ہے۔سفید رنگ کا نیلوفر ان کی آب گاہوں اور تالابوں میں اکثر پایا جاتا ہے[۴] سرمئی رنگ کی قسم

* مشیر، فیڈرل ٹیکسٹ بک ڈیولپمنٹ، نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد

جسے نیل بھی کہا جاتا ہے، وہاں استعمال نہیں ہوتی۔ ہم نے یہ قسم ہندوستان میں نہیں دیکھی۔ اگر کہیں باہر سے درآمد کی گئی ہو تو ایسا ہوسکتا ہے۔ سرمئی رنگ کی قسم رات کو سرخ نظر آتی ہے لیکن یہ سرخی حقیقی نہیں ہوتی محض خیالی ہوتی ہے۔ جب سورج کی شعاعیں اس پر پڑتی ہیں تو یہ سرمئی نظر آتا ہے۔ ہر پھول جو سرمئی رنگ کا ہوگا، اس خاصیت کا حامل ہوگا، جیسے کنول۔ اگر سرمئی رنگت کی قسم پر سرکہ رگڑا جائے تو یہ سرخ گلاب کی مانند سرخ نظر آئے گی جسے پانی میں ڈبودیں تو رنگت سبزی مائل ہو جائے گی۔ اگر راکھ اور سیسے کا میل اس پر چھڑکا جائے اور ہلکا سا ملا جائے تو اس کی رنگت زنگار اور پستے جیسی ہوجاتی ہے۔

سرخ یاقوت کے دو درجے ہیں۔ ایک اعلیٰ درجہ جو لوگوں میں مقبول ہے اور دوسرا بہت ہلکا جسے کوئی پسند کی نظر سے نہیں دیکھتا۔ اعلیٰ درجہ رمانی[5] ہے، جس کے بعد بہرمانی، ارغوانی لحمی، گلناری اور گلابی ہیں۔ بعض مصنفین نے بنفشی بھی کہا ہے جو ارغوانی اور لحمی کا درمیانی رنگ ہے۔ ہم نے جو درجات بیان کیے ہیں یہ ذرا ملتے جلتے ہیں۔ ہر قوم اور ملک میں ان درجوں کے نام مختلف ہوسکتے ہیں۔

بعض نے رمانی (انار کی مانند) اور بہرمانی کو ایک جیسی رنگتیں قرار دیا ہے، لیکن عراق کے لوگ رمانی کا نام استعمال کرتے ہیں۔ جب کہ فارسی، عراق (اہل جبل) اور خراسان کے لوگ اسے بہرمانی کہتے ہیں۔ الکندی کی درجہ بندی مابعد کو اہمیت دیتی ہے اور وہ بہرمانی کو بہترین قسم قرار دیتا ہے۔

یاقوت کی انار کی مانند رنگت کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اگر صاف چاندی پر قرمزی رنگ خون چھڑکا جائے تو نتیجے میں نظر آنے والا رنگ انار کی مانند یاقوتی رنگت ہوگا۔ قرمزی رنگ خون وہ ہے جو گرم، صحت مند اور سرخ رگوں میں دوڑتا ہے۔ دل کے دائیں جوف کا خون قرمزی رنگ ہوتا ہے[6]۔

الکندی نے گلابی قسم کا ذکر پہلے کیا ہے۔ یہ ہلکا گلابی سفیدی مائل ہوتا ہے لیکن اس نے گلابی پر خیری کو ترجیح دی ہے۔ اس پر سرخ زعفرانی رنگ احمر عصفری ہے جو زردی مائل تیز زعفران کا رنگ ہے۔ اس پر ترجیح بہرمانی عصفری کو حاصل ہے جو خالص ہے اور کسی ملاوٹ سے پاک ہے۔ زرد قسم درجہ بدرجہ سرخی کے باعث پیدا ہوتی جاتی ہے۔ حتیٰ کہ وہ پوری طرح سے سرخ ہوجاتی ہے۔ یہ بہرمانی قسم ہے۔ یہ تمام پتھر رنگت، شفافیت، دمک، آب اور تاب کے لحاظ سے اور ملاوٹ سے پاک ہونے کے حوالے سے مختلف خاصیتیں رکھتے ہیں۔

ان قسموں کے بیان میں نصر مومی وردی کو صاف، دمکیلا اور گلابی رنگ کا قرار دیتا ہے۔ چوتھی قسم جمری ہے، جو خاکستری چمک رکھتی ہے۔ میرا پختہ یقین ہے کہ الکندی نے جسے خیری کہا ہے، وہی جمری ہے۔ نقل کرنے والے نے جمری کو خیری لکھ دیا ہے (واللہ اعلم)۔ رمانی وہ قسم ہے جو گلابی اور جمری کے درمیان ہے۔

بہترین یاقوت بہرمانی ہے اور ارغوانی جو گہرے سرخ رنگ کا ہوتا ہے بہرمانی ہے۔ بہرمان کا مطلب ہے زعفران۔ کہا جاتا ہے کہ ''ثوب مبہرم'' کا مطلب ہے زعفران سے رنگا ہوا کپڑا لیکن یاقوت کے جس دمکیلے رنگ کی بات کرتے ہیں

وہ زعفران کی چمک نہیں کیونکہ یہ پیلا ہوتا ہے اور گوشت کی مانند خشک لیکن وہ ایسے پانی کی مانند ہونا چاہیے جس سے نشاستہ نکل چکا ہو یا پھر اس پانی سے جو مشروب بنے۔ زعفران سے رنگی ہوئی کسی شے کا تلازم انار سے کیا جاتا ہے اور اس کی شراب (جریال) صرف اسی صورت میں اچھی سمجھی جاتی ہے، جب اس کا رنگ انار جیسا ہو۔ وقت گزرنے کے ساتھ یہ شراب مختلف رنگتوں میں ڈھلتی ہے۔ کبھی جریال کو زعفران کا مترادف قرار دیا جاتا ہے جیسا کہ نابغہ الجعدی کا یہ شعر ہے:

ورقیق حاشیه الازار ترکة
بثیا به کعصارة الجریال

(میں نے اسے اس حالت میں چھوڑا کہ اس کے کپڑے زعفران (جریال) میں نچڑے ہوئے لگتے تھے)

جریال کا لفظ پرانی شراب رووق کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے۔ بعض اوقات یہ لفظ رنگ کے لیے اور بعض اوقات ''رنگے ہوئے'' کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ اعشیٰ نے شراب کو تشبیہہ دیتے ہوئے کہا ہے ؎

وسبیئة ما تعتق بابل
کدم الذبیح سلبتها جریالها

(جام میں پرانی شراب یوں لگتی ہے جیسے میرے ذبیحے کا جریال (رنگ) خون)

خلیل بن احمد کہتا ہے کہ بہرمان زعفران کی ایک قسم ہے۔ اگر یہ درست ہے تو بہرمانی قسم بہترین ہوگی کہ یہی یاقوت کا وصف ہے۔ سری الرفا نے اپنی کتاب المشموم (عطریات) میں لکھا ہے کہ عصفر حمیریوں کا لفظ ہے۔ دوسری طرف حمزہ کے نزدیک یہ فارسی لفظ ہسکفر کا معرّب ہے کیونکہ زعفران کو ''ہسک'' کہا جاتا ہے اور اس کے بیج کو فارسی میں ''ہسک دانہ'' کہا جاتا ہے اور اس کے پانی کو آفت سمجھا جاتا ہے۔ یعنی عندم (اژدہے کا خون)۔ اس کی کلیاں بہرام کہلاتی ہیں جس کا معرب ہے بہرم، بہرمان اور بہرامج (بہرامہ)[۷]۔ اس سے کپڑوں کو رنگتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ فارسی میں مریخ کو بہرام اسی لیے کہتے ہیں کیونکہ وہ سرخ (زرد) رنگ کا ہے۔ زعفران ہندی میں ''کسنب'' کہلاتا ہے۔ کتاب المشاہیر میں درج ہے کہ جنگلی توت جسے رنف یا ریف کہا جاتا ہے ''بری بہرامہ'' ہے جس کا مطلب ہے کہ یہ ''بری زعفران'' ہے۔

ابوحنیفہ دنیوری نے اپنی کتاب النبات میں لکھا ہے کہ ''رنف'' ایک پہاڑی پودا ہے جسے ''خلاف البلخی'' کہا جاتا ہے۔ بری بہرامہ کے پتے رات کو بند ہو جاتے ہیں اور دن کو کھلتے ہیں۔ اصل میں یہ ایک فارسی لفظ ہے۔ اس کی کلیوں کی ایک نوع بہت سرخ ہوتی ہے اور ہلکی سی جھولتی ہے۔ رہا یہ بیان کہ اس پودے کی پتیاں رات کو باہم مل جاتی ہیں تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ ایسا نیلوفر یا آذریون میں نہیں ہوتا۔ وہ ڈھیلی یا جھکی ہوتی ہیں۔ خلاف البلخی بلخ میں ''سرشک'' کہلاتا ہے۔ سرشک اس پودے سے نکلا ہوا پانی ہے۔ یہ اس کے عرق کی صورت میں کشید کیا جاتا ہے۔ اس کی پتیاں نرگس (سوسن) کی پتیوں سے چھوٹی ہوتی ہیں۔ یہ نرگس سے اس لیے مشابہ ہوتا ہے کہ اس کی پتیاں دو رویہ آپس میں ملی ہوتی ہیں۔ جب سورج طلوع ہوتا ہے تو یہ ایک دوسرے سے ہٹ جاتی ہیں، دوپہر کو پوری طرح سے کھل جاتی ہیں اور جب وہ غروب ہوتا

ہے تو یہ سابقہ حالت پر آ جاتی ہیں، جیسے مرجھائی ہوں۔ ایسا تمام شمسی پتیوں کے حوالے سے صحیح ہے جو سورج کے ساتھ ساتھ رواں رہتی ہیں۔ یہ خاصیت صرف چند پودوں میں نمی کی کمی سے ظاہر ہوتی ہے جبکہ دوسروں میں مخفی رہتی ہے۔

زعفران سے کشید کردہ عرق کے حوالے سے جسے حمزہ نے عندم سے ہم آہنگ کیا ہے، لغات دان کہتے ہیں کہ (عندم) سرخ پودا ہے جو صحراؤں میں اُگتا ہے۔ یہ ''لفاہ'' یا ''مردم گیاہ'' سے چھوٹا ہوتا ہے۔ اسے ''حُرف'' بھی کہتے ہیں[8]۔ اس کا سرخ رنگ سرخ پودوں کا مترادف سمجھا جاتا ہے۔ کئی مصنفین نے اسے ''بُقم'' بھی کہا ہے جو زعفران کے عرق کی مانند ہوتا ہے۔ شاعر عجاج کہتا ہے:

يجيش من بين تراقيه دمه
كرجل الصباغ جاش بقمه
(اس کی گردن سے خون اس طرح نکلتا ہے جیسے بقم سے نکلتا ہوا رنگ)

عندم اور بقم کو خون سے تشبیہ دی جاتی ہے۔ بُقم کی پتیاں ''اسپند'' یا کالا دانہ سے مشابہ ہوتی ہیں۔ یہ خیبر میں تل (طل) کے وزن کے حساب سے ''صنفیر'' کے نام سے بکتی ہیں۔ ایک تل سو قاطیہ کے برابر ہوتا ہے اور ایک قاطیہ سو امن کے برابر ہے[10]۔ ایک تل سونے کے ساڑھے اٹھتیس (۳۸ء۵) مثقال کے برابر ہوتا ہے۔ جو سونے کے چار دانیق کے مساوی ہے[11] خیبر میں سونا نصف نیشاپوری دینار کی قیمت رکھتا ہے[11]۔

بعض نے عندم کو ''ایدع'' کہا ہے۔ ایدع جنگلی بیروں کا ریشہ ہے۔ ابوحنیفہ نے ایک بدو سے سنا کہ یہ ایک سبزہ ہے جسے نیل کہتے ہیں۔ اس کی کلیاں چمکدار سرخ رنگ کی ہوتی ہیں اور انھیں عندم کہا جاتا ہے۔ ابوحنیفہ نے کہا ہے کہ انھوں نے کسی اور سے ایسا نہیں سنا۔ دیوان الادب میں کہا گیا ہے کہ عندم اژدہے کا خون ہے۔ فارسی میں اسے خونِ سیاوشان کہا جاتا ہے۔ ایران کے لوگوں کا عقیدہ ہے کہ یہ (پودا) سیاوشان کے خون سے اگا ہے جو کیکاؤس کا بیٹا تھا اور بے گناہ مارا گیا۔ ہندی مترادف بھی اس کے قریب قریب ہے۔ ہند کے لوگ اسے ''پانڈورَت'' کہتے ہیں۔ یعنی پانڈو کا خون۔ پانڈو ایک خاندان کا نام ہے، جنھیں اپنے چچازاد کوروؤں سے جنگ لڑنا پڑی اور تاریخ میں ان کا رَن مشہور ہے۔ دونوں طرف سے بہت خون بہایا گیا تھا۔ عجاج کہتا ہے:

فادرع القوم سرابيل الدم
على النحود كرشاش العندم
(قوم نے خون کا لبادہ اوڑھ لیا ہے اور ان کی چھاتیوں کو اژدہے کے خون نے رنگا ہے)

اس نے مزید کہا

من اسد خفان يخال العندما
منه بلبات و خطم اسحما
(خفان کا وہ شیر جس کی گردن اور چھاتی پر اژدہے کا خون بکھرا اور سیاہ ہو گیا)

اس طرح کے کئی اشعار موجود ہیں لیکن عربی ادب میں عندم اور خون کی تشبیہ کے حوالے سے شراب اور خون کی تشبیہ موجود نہیں اور ان کے درمیان اس کی ماہیئت کے بارے میں یہ بات واضح طور پر اختلافی ہے۔تمام منجم **المجسطی** کے نام سے واقف ہیں کیوں کہ یہ کتاب ان کے لیے کتابِ حوالہ ہے اور کوئی کتاب اس سے معتبر نہیں ہوسکتی۔لیکن لوگ اس کے معنی سے ناواقف ہیں۔وہ اس لفظ کی وجہ تخلیق بھی نہیں جانتے۔یہ یونانی لفظ نہیں ہے۔

ابن دریدار جوان کے بارے میں لکھتا ہے کہ یہ فارسی لفظ کا معرّب ہے۔پھول کا رنگ گہرا سرخ ہے۔اسے قرمز بھی کہا جاتا ہے۔کسی کپڑے کے رنگ کو بڑھا چڑھا کر بیان کرتے ہوئے اسے ارغوانی یا بہرمانی کہتے ہیں۔اہلِ فارس اسے گلِ ارغوان کہتے ہیں جس سے عربی لفظ (ارجوان) نکلا ہے۔یہ پھول ایک درخت پر اگتے ہیں جو عام طور پر نہیں اُگتا۔ پھول بڑے سرخ اور شراب رنگ ہوتے ہیں۔یہ بے بو ہوتے ہیں لیکن بہت شاندار لگتے ہیں۔خواہ اس لفظ کی اصل عربی ہو یا فارسی لیکن اہلِ عرب اسے اکثر استعمال کرتے ہیں۔عمرو بن کلثوم نے کہا ہے ؎

کان ثیا بنا منا و منهم
خضبن بار جوان اوطلینا

(ان پر یوں لگتا ہے گویا ان کے کپڑے ارجوان یا ارغوان میں رنگے تھے)

قدیم دور میں ارجوانی / ارغوانی رنگ کا لباس قیصرِ روم کا تھا اور عوام کے لیے اس رنگ کا لباس پہننا ممنوع تھا کیونکہ ان کا عقیدہ تھا کہ یہ رنگ گھونگھے کے خون کا ہے۔صور کے لوگوں کے علم کے مطابق ایک کتے کو یہ جانور کھلایا گیا تھا،اس کی تھوتھنی کا رنگ اس طرح سے تبدیل ہوگیا تھا۔

بان ینال شنوی نے ساسانی بادشاہوں کے سامنے یہ بات بیان کی تھی کہ عظیم قتائی کا لباس ارغوانی رنگ کا تھا اور اسی کے ساتھ اس طرح مخصوص تھا کہ کوئی اور اسے نہ پہن سکتا تھا۔جالینوس قرمز کے بارے میں بتاتا ہے کہ اسے سمندر سے تازہ اور ٹھنڈا پکڑا جاتا ہے۔اس کا یہ دعویٰ ہمیں اہلِ صور کی تائید نظر آتا ہے۔

اب ہم اپنی اصل بحث کی طرف آتے ہیں جہاں ہم نے زیادہ تفہیم کے لیے گریز کیا تھا۔الکندی نے یاقوت کے جو عیوب اور نقائص گنوائے ہیں ان میں سے داخلی دھبے اگر بہت واضح اور گہرے ہوں تو دور نہیں ہوسکتے۔دوسرا نقص ''خلط الحجارۃ'' (پتھروں کی آمیزش) ہے۔اسے ''حرملیات'' بھی کہتے ہیں۔حرمل سفید دانے ہوتے ہیں اور فارسی میں اسے ''کنجدہ'' کہتے ہیں۔ایک اور نقص ''ریم'' ہے جو کیچڑ کی مانند ہوتا ہے۔ایک اور بھی ہے۔مساموں کا سا انداز جو روشنی کے گزر کے لیے اس کے شفاف اور صاف ہونے میں مانع ہوتا ہے۔یہ ایک درز کی صورت میں بھی نظر آتا ہے جو شیشے، بلور یا گاز کے دخل سے پیدا ہوتا ہے۔بعض اوقات اس درز سے پانی گزر سکتا ہے۔یہ دراصل طبعی نقص ہے اور عارضی ہے۔ رنگوں کا اختلاف مثلاً کسی حصے میں زیادہ ہونا اور کسی میں کم ایک نقص سمجھا جاتا ہے۔بادلوں کا سا غبار بھی پتھر کی قیمت کم کر

دیتا ہے۔ پتھر کے کسی حصے پر موتیوں جیسا دھبہ بھی ہوسکتا ہے۔ یہ نقص ''اسین'' کہلاتا ہے۔ اگر گہرا نہ ہوتو یہ پتھر کو گھسنے سے خارج ہوجاتا ہے۔ اگر یہ بہت گہرا ہوتو اس نقص کا ازالہ کرنے کا کوئی دوسرا طریقہ نہیں۔

الکندی کے مطابق معدن کا لفظ عدن سے نکلا ہے، جس کے معنی ہیں: اقامہ۔ غالباً یہ لفظ کسی کان کے اندر، نکالنے سے قبل، معدنیات کے ایک طویل عرصے تک رہنے کے باعث استعمال میں آیا۔ یا پھر یہ لفظ کھدائی کے لیے کان کنوں کے عرصہ تک قیام کرنے کے باعث مستخرج ہوا۔

یاقوت کے معدن سراندیپ (سری لنکا) کے جزائر میں واقع ہیں۔ یہ بحر ہند کے پاس ہے۔ کانیں ساحلی پہاڑوں میں ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ سرخ یاقوت معدن میں پتھروں کے غلاف میں اسی طرح لپٹا ہوتا ہے جیسے انار کے دانے چھلکوں کے اندر ہوتے ہیں۔ ایسا لعلِ بدخشاں کے سلسلے میں بھی ہوتا ہے لیکن وہ بلور یا گاز کے غلاف میں ہوتا ہے [۱۲]۔

تمام شفاف اشیا اصل میں پانی ہیں جو متحجر ہو (پتھرا) گیا ہے [۱۳]۔ اگرچہ یہ عمل قدرتی طور پر ہوتا ہے۔ ان کے اندر کئی ایسی چیزیں ہوتی ہیں جن کا کوئی تعلق اس سے نہیں ہوتا جیسے ہوا کے بلبلے، پانی کے قطرے، گھاس کے پتے، لکڑی کے ٹکڑے وغیرہ۔ ہم آگے بلوری اقسام کی ذیل میں ان کا ذکر کریں گے۔

ہر مائع کو چوں کہ وہ بہہ جاتا ہے، بہنے اور بکھرنے سے روکنے کے لیے کوئی ظرف چاہیے۔ ظرف گویا اس کا محافظ ہوتا ہے۔ یہ ایک معلوم کلی امر ہے۔ یہ مائع کیونکر جمے اور کن حالات میں اور کس طرح مختلف رنگ اختیار کیے؟ یہ کوئی ایسی بات نہیں جس کا اندازہ محض تخیل کے زور پر لگایا جائے۔ اللہ ان چیزوں کا صناع اور صورت گر ہے۔

مندرجہ بالا فرضیے کی ایک اور دلیل موجود ہے۔ یاقوت کو قلماؤ اور اس کی سرخی کو زیادہ چمکدار بنانے کے لیے مزید حرارت درکار ہوتی ہے۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اس میں کوئی بنفشی رنگ کی چیز آمیز ہے اور ہم اس میں اکثر مٹی، ریت یا پتھروں کی آمیزش پاتے ہیں [۱۴]۔

اس لیے جوہری یاقوت کی بیرونی چھال اتار دیتا ہے۔ اگر یہ نقائص سطح کے قریب ہوں تو ختم ہو سکتے ہیں۔ اگرچہ اس سے پتھر کا وزن کم ہوجاتا ہے اور سطح ہموار نہیں رہتی۔ نقائص کی گہرائی مختلف ہوتی ہے۔ اگر نقص بہت گہرا ہو تو وہ ہوا کا بلبلہ خارج کرنے کے لیے سوراخ کرتا ہے جس سے گرم کرنے پر جوہر پھوٹ نہیں سکتا۔ ممکن ہے کہ ابوتمام نے اپنا قول یہیں سے لیا ہو:

نفق المديح ببا يه فكسوته
عقدا من الياقوت غير مثقب

(جب میری تمام مدح اس کے دروازے پر ختم ہوئی تو میں نے ناسُفتہ یاقوت کا ہار اس کے گلے میں ڈال دیا)

عقد کا مطلب ہی ہار ہے۔ ایسا ہار جو لونگ کے سنجاب میں بنا ہو۔ تمام مدح کا اختتام مطلوب فرد پر تحائف کی بارش ہے۔ یاقوت کا ہار اسی مدح کو ظاہر کرتا ہے۔ عام طور پر یاقوت کی لڑیاں ہاتھوں میں پہنی جاتی ہیں اور شاعر یہ کہتا ہے کہ اس کے ہاتھ یاقوت کی لڑیوں سے سج گئے ہیں۔ ہار یا لڑیاں انھیں سُفتہ کیے بغیر نہیں بن سکتیں اور شاعر نے یہ مدح یاقوت کے

حوالے سے کی ہے اور لڑیوں کے یاقوتی منکوں میں مساموں سے انکار کیا ہے۔ گویا اس نے (ہماری) تعقلی راہ اپنائی ہے۔ وہ ظاہر کرنا چاہتا ہے کہ ہار بہترین یاقوت سے پروئے گئے ہیں۔ جیسا کہ بحتری کے شعر کی مثال ہے:

ننظم منها لؤ لؤ فی سلوکه
و من عجب تنظیم عالم یثقب

(ہم ان موتیوں کو دھاگے میں پرو رہے ہیں۔ سقم کے بغیر انھیں جوڑا، عجیب بات ہے)

اور واوالد مشقی نے کہا ہے

اری الدر یثقبه الناظمون
ولم یثقبوا ذا فکیف انتظم

(میں دھاگا ڈالنے والوں کو موتیوں میں سوراخ کرتے دیکھتا ہوں۔ اگر یہ سقم نہ ہوں تو وہ کیسے پروئے جائیں)

لفظ ''غیر مثقب'' (ناسقم) صاف، خالص اور نقائص کے پاک ہونے کی طرف اشارہ کرتا ہے جس کا ہم نے اوپر ذکر کیا ہے۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ ان میں سونے کا جوڑ بھی نہیں بھرا جاتا۔ جوڑ یہ شک پیدا کرتا ہے کہ پتھر ٹوٹ پھوٹ سکتا ہے۔ اسی لیے شاعر نے پتھروں کے آپس میں پرونے کے لیے کوئی مثال قائم نہیں کی کیونکہ یہ ناممکن ہے کہ پتھروں میں سوراخ کیے بغیر انھیں جوڑ دیا جائے اور یہ بھی ممکن نہیں کہ پتھروں کا ہار بغیر دھاگے میں پروئے پہنا جا سکے۔ جب یوں متضاد اشیا یک جا کی جائیں تو اصل کی تجنیس اپنے حسن میں بری طرح متاثر ہوتی ہے۔ اس سے ہم یہ سمجھے ہیں کہ ہار تبھی پہنا جا سکتا ہے اگر اس میں سوراخ کیے گئے ہوں اور سوراخ ہار کا نقص سمجھے جائیں گے کیونکہ یہ یاقوت کے اوصاف میں سے ہے۔ ابونصر شراب کی توصیف میں کہتا ہے:

انی بذلت لها لما سمعت بها
صاعا بصاع من الیاقوت ما ثقبا

(میں نے اسے جام بھر کر دیا اور جب میں نے اس کے بارے میں سنا تو مٹھی بھر ناسقم یاقوت دیے)

ان سوراخوں میں ایک اور خدشہ موجود ہوتا ہے کہ ان میں تل برابر زہر ہو سکتا ہے۔ جوہریوں کی یہ عادت بہت خطرناک ہے کہ وہ گرد صاف کرنے کے لیے پتھر کو اپنے لعاب دہن سے تر کرتے ہیں تاکہ وہ چمک اٹھے۔ مجھے یقین ہے کہ خودکشیوں کے قصے خاص طور پر جیلوں میں بے عزتی کے خوف سے موتی یا پتھر نگل کر خودکشی کرنا وغیرہ اسی ذیل سے تعلق رکھتے ہیں۔ جب بطلیموس کی بیٹی قلوپطرہ کو آگسٹس قیصر سے جان اور حیثیت کا خطرہ ہوا تو اس نے اپنی چھاتیوں پر دو سانپ ڈسوائے تھے۔ وہ اس حالت میں پائی گئی تھی کہ اس نے اپنا تاج پہن رکھا تھا اور دایاں ہاتھ سر کے نیچے رکھا ہوا تھا۔ لیکن اس نے دشمن کے ہاتھوں اپنی آن پر کوئی حرف نہ آنے دیا۔

سوراخ یا تو پتھر کے آر پار کیے جاتے ہیں یا کسی ایسی چیز سے بھرے جاتے ہیں جو اس کی جلا میں اضافہ کرتے ہیں۔ ہوا سوراخوں سے گزر سکتی ہے لیکن وہ یاقوت کی چمک میں اضافہ نہیں کرتی کیونکہ یہ بنیادی معائب ہیں جو اس کی

قدر میں کوئی کردار ادا نہیں کرتے۔ اگر دوسری طرف پتھر میں کوئی ایسی چیز بھری جائے جو اس کی سرخی میں اضافہ کرے تو یہ پتھر کے نقائص چھپانے کی ایک کوشش ہوگی۔ ایسی تمام چیزیں معائب ہی میں شمار ہوں گی۔ بعض اوقات یہ کوشش فطری محسوس ہوتی ہے جیسے پتھر کا رنگ دل کو بھاتا نہ ہو اور ایک چمکدار سرخ نقطہ اس پر ظاہر ہو اور سارے پتھر میں پھیلا محسوس ہو جس سے وہ خوبصورت لگنے لگے۔

ارسطو سے منسوب کتاب الاحجار (The Stones) (میرے نزدیک یہ منسوبہ غلط ہے) میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ یاقوت پر ایک سرخ مقام ظاہر ہوتا ہے اور پورے پتھر میں پھیل جاتا ہے۔ گرم کرنے پر یہ سرخ نقطہ پھیل کر پتھر کی خوبصورتی میں اضافہ کرتا ہے۔ اگر یاقوت گہرے رنگ کا ہو تو اس طریقے سے اس کا یہ گہرا پن ختم ہو جاتا ہے۔

جاحظ کہتا ہے کہ میں نے کسی شخص کے پاس موجود یاقوت کا ذکر سنا ہے۔ وہ اس کے جسم سے گرا اور قریب ہی ایک شتر مرغ اسے نگل گیا۔ صرف دو مانوی زندیقوں نے پتھر کا یہ تماشا دیکھا تھا۔ ان پہ شک کیا گیا اور انھیں ضرب پہنچائی گئی۔ جب ایک کو مار پڑ رہی تھی تو دوسرے نے اس کی بے گناہی کی شہادت دی۔ جب یہ معلوم ہوا کہ دونوں مانوی ہیں تو مزید تفتیش کی گئی۔ کسی اور نے بتایا کہ پتھر کو شتر مرغ نے نگل لیا تھا اور یہ مانوی نہیں چاہتے تھے کہ اسے ذبح کیا جائے۔ آخر کار شتر مرغ کو مارا گیا اور اس کے پوٹے کو چیرا گیا۔ معلوم ہوا کہ پتھر ہلکا لیکن رنگ میں صاف اور زیادہ خوبصورت ہو گیا ہے۔ پوٹے کی حرارت نے آگ کا کام کیا۔ اس واقعے کو بہت شہرت ملی۔ امام شافعی سے اس واقعے کی شرعی رائے معلوم کی گئی تو انھوں نے کہا:

> میں پتھر کے مالک کے بارے میں اس کے سوا کیا کہہ سکتا ہوں کہ اگر وہ دانش مند ہے تو اسے شتر مرغ کو مارنا ہی چاہیے تھا اور پتھر حاصل کر لینا چاہیے تھا اور شتر مرغ کے مالک کو اس کی وہ قیمت دینا چاہیے جو اس کی زندگی اور موت کی حالت کے درمیان کی ہو۔

ابوالقاسم بن بابک نے شاعر ابوتمام کے برعکس ہی کہا ہے:

علیه عقود الدر فصل بینها
من الدر والیاقوت نظم مثقب

(وہ موتیوں کی لڑیوں سے لدا پھندا ہے جو سوراخ دار موتیوں اور یاقوت کے بیچ میں ہے)

الکندی لکھتا ہے:

> میں نے کچھ پتھر حاصل کیے جو ہندوستان سے لائے گئے تھے۔ وہ آگ کے ذریعے صاف نہیں کیے گئے تھے۔ جب میں نے انھیں گرم کیا تو بہت عمدہ رنگ ظاہر ہوا۔ ان میں ایک گہرے رنگ کا پتھر تھا جس کی شفافیت میں ذرا سا سرخ رنگ جھلکتا تھا۔ دوسرا پتھر ذرا سا رنگین تھا۔ میں نے انھیں ایک کٹھالی میں پچاس مثقال سونا پگھلانے کے وقت تک کے لیے پگھلایا۔ جب دونوں پتھر سرد ہوئے تو ہلکا رنگ رکھنے والا شفاف ہو گیا اور قدرے گلابی نظر آنے لگا۔ دوسرا جو ذرا اوردی تھا، وہ سراندیپی بلور کی مانند ہو گیا۔ مجھے یہ یاقوت سے زیادہ صاف اور ہموار نظر آیا۔ اس سے یہ عمل سامنے آیا کہ سرخی مائل قسم کو اس وقت تک گرم کیا جائے کہ رنگوں کی آمیزش ختم ہو جائے۔

الکندی مزید لکھتا ہے:

یہ جان لینا چاہیے کہ اگر پتھر ایک بار اپنی سرخ رنگت چھوڑ بیٹھے تو یہ یاقوت نہیں ہے لیکن وہ تمام پتھر جو سرخ رنگ کے ہیں یاقوت نہیں ہوتے جیسے کہ لوہا یاقوت نہیں جبکہ وہ حرارت دینے سے سرخ رنگ پر دہکتا ہے۔

مزید برآں اس نے یہ کہا ہے:

کسی یاقوت کا آگ دینے کے بعد معائنہ کرنا چاہیے اور اگر وہ صاف نہ ہو تو اسے پھر حرارت دینی چاہیے۔

عراقی تاجر گہرے رنگ کی قسم رکھنے کے باوجود اس کی زیادہ قیمت مانگتے ہیں۔ وہ اسے صغدی کٹھالی میں گرم کرتے ہیں اور حرارت کا یہ عمل ان میں ہلکا پن پیدا کر دیتا ہے۔ پتھر دو کٹھالیوں کے مابین رکھ کر پوری بھٹی کو بند کر دیا جاتا ہے۔ پتھروں کو صرف ان کٹھالیوں میں حرارت دی جاتی ہے جو جواہر کے لیے استعمال ہوتی ہیں۔ حرارت کا یہ عمل ایک مثقال سونے کو پگھلانے کے عرصے تک جاری رکھا جاتا ہے۔ جواہرات کو سرد کرنے کے لیے ضماد یا لیپ استعمال کیا جاتا ہے۔ بال آخر وہ پتھر صاف اور شفاف بلور کی مانند ہو جاتا ہے اور اعلیٰ قیمت پاتا ہے۔ یہ عمل اس وقت کیا جاتا ہے جب پتھر کو ہر قسم کی آلایشوں اور معائب سے پاک کرنا ہوتا ہے۔ پتھر کے دریافت ہونے کی جگہ ہی سے حاصل چیزوں کا ضماد اس پر کیا جاتا ہے۔ یہ ماخذ مٹی اور مکھن میں ملا کر خشک کیا جاتا ہے۔ پھر اسے لکڑی کی آگ پر گرم کیا جاتا ہے۔ جوہری عرصۂ حرارت سے بخوبی واقف ہوتا ہے۔ ایک گھنٹہ تک ہلکی اور پھر چوبیس گھنٹے تک تیز حرارت دی جاتی ہے۔ جس کے بعد اسے سرد کیا جاتا ہے۔ اگر پتھر صاف نہ ہو تو اسے پھر سے حرارت دی جاتی ہے۔

جہاں تک یاقوت کے معدن کا تعلق ہے، کہا جاتا ہے کہ یہ سراندیپ کے اردگرد ایک گاؤں نغز میں موجود ہے۔ وہاں موجود پہاڑوں سے اسے نکالتے ہیں۔ ہندی زبان میں سراندیپ کو سنگلا دیپ کہتے ہیں۔ ''دیپ'' کے معنی جزیرے کے ہیں جب میں نے اس نام پر غور کیا تو معلوم ہوا کہ یہ نام جزیروں کے ایک مجموعے (سنگل/زنجیر) کا ہے۔ ان میں ایک مادر جزیرہ اور اس کے اردگرد کئی چھوٹے چھوٹے جزائر ہیں۔ اہل عرب اس سے بخوبی آگاہ ہیں جیسا کہ عمرو بن احمر نے کہا ہے:

فخر و جال المهر ذب شماله
كسيف السرندى لاح فى كف صاقل

(وہ گرا اور اس نے گھوڑا بائیں جانب موڑا جیسے سراندیپ کی تلوار چمکانے والے کے ہاتھ میں ہوتی ہے)

سراندیپ کی ساحلی بندرگاہ مُندری پتن کہلاتی ہے جسے خراسانی مدراپتان کہتے ہیں۔ یہ سلطنتِ چلاہ کی سرحد اول ہے۔ چلاہ کا لفظ اس علاقے کے ہر حکمران کا لقب ہے۔ بیجاپور کا دارالحکومت اس کے شمال مشرق میں واقع ہے۔ پھر سیلون کے سامنے بلگران ہے جہاں یاقوت کی پیلی اور سرمئی قسم دریافت ہوئی ہے اور مزید شمال کی طرف رونگ کی حد ہے جہاں کوہِ برق موجود ہے اور اس کے دامن میں سرخ یاقوت کی کان ہے۔ اس علاقے کے لوگوں کا خیال ہے کہ سرخ یاقوت بننے کی وجہ بجلی ہے۔ یہ بجلی نہیں جو بادلوں میں گرجتی ہے اور اس میں قید ہوتی ہے۔ یہ پہاڑی آتش فشانی ہے جو ہر وقت بڑے بڑے شعلوں کی طرح نظر آتی ہے اور بجلی کے کوندے کی طرح دکھائی دیتی ہے۔ یہ روشنی کشتیوں اور جہازوں کو بہت

دور سے نظر آنے کے باعث رہنمائی مہیا کرتی ہے جیسا کہ عبادان سے دور جہاز کنکوان میں لکڑی کی آگ یا سکندریہ کے منارہ سے رہنمائی پاتے ہیں۔ دن کے وقت یہ روشنی دھوئیں کی صورت میں دکھائی دیتی ہے۔

مسعودی اپنی کتاب المسالک و الممالک میں لکھتا ہے کہ راہون کے پہاڑ پر حضرت آدمؑ کے اترنے کا قصّہ مشہور ہے۔ میرا خیال ہے کہ راہون عربی میں ''رونگ'' ہی کا نام ہے۔ کچھ مصنفین نے اس جزیرے پر حضرت آدم علیہ السلام کے اترنے کا یوں استدلال کیا ہے:

> اس جزیرے پر اگنے والے پودے پہلے تو ایک خاص اونچائی تک اگتے ہیں پھر زمین کی طرف ذرا سے جھک جاتے ہیں۔ بعد میں وہ بڑھتے ہیں اور کچھ اور قدآور ہو جاتے ہیں۔ درحقیقت وہ اونٹ کی گردن کی مانند ہو جاتے ہیں اور سجدے میں جاتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ گویا فرشتوں نے آدم کو یوں سجدہ کیا تھا۔

لیکن وہ لوگ یہ بھول جاتے ہیں کہ وہ جگہ جہاں یہ رسم ادا ہوئی تھی، کہیں اور واقع تھی اور وہ جگہ جہاں آدم جنت سے اتارے گئے تھے، کوئی اور تھی۔

الکندی لکھتا ہے:

> یاقوت سحان کے مقام سے نکالا جاتا ہے، جو سراندیپ کے پیچھے واقع ہے۔ یہاں ایک بڑا پہاڑ راہون ہے۔ آندھی اور سیلاب اس پہاڑ سے یاقوت منتقل کر دیتے ہیں۔ یہ جزیرہ سات لاکھ بیس ہزار فرسخ لمبا چوڑا ہے۔

ممکن ہے کہ جس شخص نے الکندی کو یہ معلومات دیں، اس نے خلفِ سراندیپ کا لفظ استعمال کیا ہو اور اس کا مطلب بھی یہی ہو کہ اس کے معنی ''پرے'' کے بھی ہو سکتے ہیں۔ لیکن جہاں تک جزائر کا تعلق ہے ورا یا پرے کا لفظ اس مقام کے لیے استعمال ہوتا ہے جو دوسری انتہا پر ہو جب کہ خلف (پیچھے) اس سمت کی طرف اشارہ کناں ہے جہاں سمندر کا بڑا حصہ موجود ہو۔ نصر نے بھی اس جزیرے کا ذکر کیا ہے لیکن اس نے اس کا نام مُندری تپن بتایا ہے۔ جب کہ ہم نے ذکر کیا ہے کہ یہ شہر ساحل پر واقع ہے اور یہ کوئی جزیرہ نہیں۔

کہا جاتا ہے کہ جب سورج کی کرنیں یاقوت پر پڑتی ہیں تو بجلی کوندتی نظر آتی ہے۔ اسے برقِ راہون کہتے ہیں۔ کوئی شخص وہاں نہیں جا سکتا، کیونکہ وہ علاقہ دشمنوں کے قبضے میں ہے [۱۵]۔ یہ محض خرافات ہیں۔ میں یہاں ایرانیوں سے حاصل کیے گئے ایسے چند قصے بیان کروں گا۔ یہ روشنیاں غروب کے بعد نظر آتی ہیں اور طلوع کے وقت غائب ہو جاتی ہیں۔ ایسی ہی کہانی رایج/ زابج کے ساحلی پہاڑوں کے بارے میں ہے جہاں دن کے وقت آگ سیاہ ہو جاتی ہے اور رات کے وقت سرخ نظر آتی ہے اور یہ کئی دن کے سفر تک دکھائی دیتی رہتی ہے۔ وہاں بھی بجلی کے کوندے لپکتے دکھائی دیتے ہیں۔ الکندی کہتا ہے:

> سیلاب کے ذریعے آنے والے یاقوت آندھی اور کیچڑ سے ملنے والے یاقوت کی نسبت بہتر ہوتے ہیں۔

اس پر حیران ہونے کی کوئی بات نہیں اور ایسا ہونا بالکل ممکن ہے [۱۶]۔ ایسی ہی ایک کہانی ایک بحری مسافر نے سنائی تھی۔

ایک بار ہمیں ہواؤں نے اخضر کے پہاڑوں کی طرف پھینک دیا جو کوہ برق کے مشرق میں ہیں۔ ملاحوں نے لنگر پھینکا اور کشتیوں کو باندھا۔

یہاں اس نے فاریقون کا درخت دیکھا اسے ساذج (سادھا) کہا جاتا ہے۔ یہ (فاریقون) نام یونانی لفظ کے مشابہ ہے حالانکہ وہاں اس کا نام فوالان یا فوللن ہے اور ہند میں اسے ''کندبیر'' کہا جاتا ہے۔ یہ بحری مسافر مزید بیان کرتا ہے:

ہمارے ملازم ساحل پر گئے اور واپسی پر بتایا کہ یہ جگہ بہت عمدہ ہے۔ یہ سن کر کپتان اپنا تھیلا لے کر ساحل پر چلا گیا۔ جیسے ہی وہ آگے گیا تو اسے ایک تالاب دکھائی دیا جس کے اردگرد جھاڑیاں موجود تھیں۔ وہاں ایک بوڑھا شخص بیٹھا تھا۔ اس نے بوڑھے کو اخروٹ، بادام، کھجوریں پیش کیں۔ بوڑھا اپنے گھر گیا اور اپنے ساتھ ریشوں سے بُنا ہوا ایک ڈبہ لایا۔ اس نے ڈبے میں سے ایک مثقال سے زیادہ وزن کا یاقوت نکالا اور کپتان کو تحائف کے تبادلے میں پیش کیا۔ کپتان نے اپنا ایک آدمی جہاز پر بھیجا اور وہ اپنے ساتھ طرح طرح کے پھل، کپڑے، رومال اور نمک وغیرہ لایا۔ اس نے یہ چیزیں بوڑھے کو پیش کر دیں۔ اس نے اپنا ہاتھ پھیلایا اور صحرا کی طرف اشارہ کر کے کہنے لگا: یہ پتھر بارشوں کے سیلاب سے آ جاتے ہیں لیکن میں انھیں اٹھاتا نہیں کیونکہ مجھے ان کی ضرورت نہیں۔ میں ایک ایماندار اور خدا پرست آدمی ہوں۔ پھر اس نے کپتان سے وعدہ کیا کہ وہ اس کے لیے یہ پتھر جمع کرے گا اور جب کبھی وہ یہاں لنگر انداز ہوگا تو وہ انھیں لے سکتا ہے۔ لیکن پھر ہم اس شخص سے نہیں ملے۔

یہ واقعہ ظاہر کرتا ہے کہ وادی میں سیلابی پانی کے ذریعے معدن سے آنے والے یاقوت بھرے ہوئے تھے۔ کتاب المخزون میں چینیوں کے بارے میں درج ہے کہ سراندیپ کے ساحلوں پر مختلف رنگوں کے یاقوت دھوئے جاتے ہیں۔ مدوجزر میں وہ خاص طور پر مد کے وقت نظر آتے ہیں۔ پانی انھیں کھوہوں، غاروں اور سیلابی جگہوں سے کھینچ لاتا ہے۔ وہ مقامات جہاں یاقوت پائے جاتے ہیں بادشاہ کے سنتریوں کے پہرے میں ہوتی ہے۔ اسی لیے بکیر الشامی نے کہا ہے ؎

ما یھاب الحسام الابحدیه
و تحسین غمده لا یھاب

(تلوار اپنی دھار کی تیزی سے ڈراتی ہے نا کہ نیام کی خوبصورتی سے)

ابوبکر الخوارزمی کہتا ہے:

وانک منھم و کذاک ایضا
من الماء الفرائد واللالی
و تسکن دارھم و کذاک سکنی
الجواھر والزبرجدفی الجبال

(تم دوسروں سے بلاشبہ الگ ہو۔ جیسے موتی اور لُولُو پانی میں اپنی آب رکھتے ہیں۔ تم لوگوں میں ایسے رہتے ہو جیسے پہاڑوں میں قیمتی جواہر اور زبرجد)

بعض اوقات جب قیمتی پتھر کسی مقام سے حاصل کیا جاتا ہے تو اس کے ساتھ دوسرے پتھر چمٹے ہوئے ملتے ہیں۔ انھیں توڑ کر الگ کر لیا جاتا ہے۔ ہندوستان میں خوردنی اشیا جیسے مونگ، مسور اور ماش اور ایک اور جسے کُلت (کلتھی) کہا

جاتا ہے۔ یہ مٹیالے اور خاکی رنگ کے ہوتے ہیں اور کرسنہ اور جلبانہ کی شکل کے ہوتے ہیں۔ جب انھیں انگلیوں سے دبایا اور نرم کیا جاتا ہے تو یہ مسور کی مانند ہو جاتے ہیں۔ اگر یہ بڑے ہوں تو لوگ انھیں نہیں کھاتے۔ یہ پتھری کے معالجے کے لیے استعمال ہوتے ہیں۔ ان پودوں کی یہ خاصیت کتابوں میں بیان ہوئی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ یہ نہ صرف مثانے کی پتھری توڑتے ہیں بلکہ پہاڑی پتھروں کو بھی توڑ دیتے ہیں۔ جب لوگ یاقوت تلاش کرتے ہیں اور کان کے اندر ایسی جگہ پہنچتے ہیں جہاں کھدائی مشکل ہوتی ہے تو وہ ان پودوں کے بیج ایک عرصے کے لیے وہاں رکھ دیتے ہیں۔ اس کے بعد چٹانیں توڑنا آسان ہو جاتا ہے۔ یہ عمل سونے اور چاندی کی کانوں میں لکڑی اور تیل جلانے کے عمل سے بہتر ہے۔

یاقوت اپنی سختی کی بنا پر تمام پتھروں سے برتر ہے۔ صرف ہیرا اس کی سختی سے برتر ہے ۱۷۔ دوسرا کوئی پتھر سوائے ہیرے کے اسے نہیں کاٹ سکتا اور صرف ہیرا ہی اسے بہتر طور پر کاٹ سکتا ہے۔ یہ اسے توڑتا نہیں ہے۔ الکندی لکھتا ہے:

> یاقوت کے پتھر کو گوکھرو کی ترشاخ سے پالش کرتے ہیں جیسا کہ دوسرے پتھروں کے لیے یہ عمل انجام دیا جاتا ہے۔ پالش کرنے کے عمل میں بعد ازاں تانبے کے ورق پر یمانی جزع (عقیق) کو چونے کے پانی میں حرارت سے تر کر کے رگڑا جاتا ہے۔ رگڑنے سے پہلے سنگ سیسہ پتھر پر رکھ کر اس کی سطح کو ریگ مال (کرنڈ) سے ہموار کر لیا جاتا ہے۔ بعض اوقات یہ پتھر کے نیچے موجود پانی کی طرف پھسل جاتا ہے۔ تانبے کے ورق پر یہ رگڑائی ایک مہینے تک جاری رہتی ہے حتیٰ کہ پالش خوب نکھر آتی ہے۔

وہ مزید لکھتا ہے:

> دمک (Lustre) یاقوت کا ایک وصف ہے۔ صاف اور پالش کیا گیا یاقوت دمکیلا ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بعض اوقات اسے چنار کی کلیوں سے تشبیہہ دی جاتی ہے جو سرخ، دہکتی ہوئی نظر آتی ہیں اور لمبے عرصے بعد راکھ ہو جاتی ہیں''۔ الراعی کہتا ہے:

جمان و یاقوت کان فصوصه
وقود الغضازان الجیوب الروادعا

(سرخ جواہر اور یاقوت چنار کی کلیوں کی طرح دہکتے ہیں جس سے گردن سج رہی ہے)

ہمارے دور کے جوہری کہتے ہیں کہ یاقوت کی رمانی قسم جو بے حد قیمتی ہے سراندیپ کے راجا کو پیش کی جاتی ہے۔ رمانی پتھر اس کی شان ہیں اور ادنیٰ معیار کے پتھر تاجروں کے لیے مقرر ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ رمانی قسم ہمارے علاقوں میں نہیں آتی اور جو بھی رمانی قسم ملتی ہے وہ پرانے ادوار کی ہے۔ بطلیموس اپنی کتاب **جغرافیہ** میں لکھتا ہے:

> یاقوت کے جزیرے کے گرد ایک سرخ پہاڑ ہے۔ یہ پہاڑ خشک زمین سے دائرے میں ابھرا ہوا ہے۔ اس کی درمیانی وادی میں شہر، چشمے اور دریا ہیں۔

اس سے یوں لگتا ہے کہ یہ جزیرہ آباد علاقوں کی انتہا میں مشرق کی طرف اور خط استوا کے قریب ہے لیکن اس نے ایسی کوئی بات نہیں لکھی جن سے وہاں یاقوتی معدن کی موجودگی ظاہر ہوتی ہو یا یہ کہ اسے یاقوت کی خاصیت کی وجہ سے

سرخ پہاڑ کہا جاتا ہو۔ نہ ہی مجھے کوئی ایسا شخص ملا جو یہ بات کرتا۔ بعض اوقات یوں بھی ہوتا ہے کہ کسی جگہ کا نام ایسی شے کی بنا پر پڑ جاتا ہے جو وہاں نہیں ہوتی۔ ایسا جزیرہ بحرِ اخضر میں دیگر جزائر میں گھرا ہوا ہے۔ اسے زابج کہا جاتا ہے۔ یہ جاوا اور دیوہ کی سمت واقع ہے۔ اسے جزیرۂ یاقوت بھی کہتے ہیں اگرچہ وہاں یاقوت کی کانیں موجود نہیں۔ اس کا نام اس لیے پڑا کیونکہ اس جزیرے کی عورتوں کے چہرے بہت خوبصورت ہوتے ہیں۔ جیسا کسی عورت کو غُب القمر اس لیے کہتے ہیں کہ یہ اس طرح سے گول ہوتا ہے کہ اس میں پانی مدوجزر کی طرح لہرائے۔ غُب کا لفظ ایسی جگہ کے لیے کہتے ہیں جہاں سمندر سطحِ زمین کے اوپر بہتا ہے۔ جہاز ایسی جگہوں سے بچتے ہیں کیونکہ یہاں پانی اُتھلا ہوتا ہے۔ جزر ایسی جگہ ہے جہاں سمندر کا پانی داخل ہوتا اور واپس ہوتا ہے اور پانی داخل ہونے کا دہانہ بڑا ہوتا ہے۔ بعض نے جزر کو غُب کا متضاد قرار دیا ہے اور کہا ہے کہ جزر زمین کی گردن نما صورت ہے جو سمندر کے اندر چلی جاتی ہے لیکن یہ محض ایک مغالطہ ہے۔

ایک جوہری بیان کرتا ہے کہ اس جزیرے کے راجا نے حجاج بن یوسف کی طرف عورتیں بھیجیں جو مسلمان تھیں اور ان کے والدین فوت ہو چکے تھے۔ اس لیے وہ یتیم تھیں۔ راجا حجاج کی خوشنودی چاہتا تھا۔ یہ (جہاز) میدیوں کے ہتھے چڑھ گیا جو دیبل کے بحری قزاق تھے۔ بوارج کی زبان میں بیرہ) بیڑا) یعنی کشتیاں کہلاتے ہیں۔ یہ عورتیں اغوا کر لی گئیں۔ ان میں سے بنی یربوع کی ایک عورت چلّائی ''حجاج۔ یا حجاج'' اور جب حجاج نے اس چیخ و پکار کو سنا تو کہا ''لبیک''۔ جیسا کہ سرحدوں سے ایک بیوہ نے المعتصم کو روم کی جنگ کے دوران میں پکارا تھا اور اس نے جواباً کہا تھا۔ ''میں آ رہا ہوں''۔ حجاج نے داہر بن چچ کو عورتیں واپس کرنے کے لیے لکھا۔ داہر نے اسے نظر انداز کرتے ہوئے جواب میں لکھا ''میں انھیں بحری قزاقوں سے نہیں چھڑا سکتا''۔ حجاج نے محمد بن قاسم بن مُنبّہ کو اموی خلافت کی سرحدوں پر سندھ کی طرف بھیجا۔ اس وقت وہ صرف سترہ برس کا تھا۔ محمد بن قاسم نے حجاج کو لکھا کہ اسے سر کہ نہیں ملتا۔ اس پر حجاج نے پرانے اور تیز سرکے میں روئی بھگو کر اسے سائے میں خشک کیا، جس سے سارا سرکہ جذب ہو گیا۔ تیار ہونے کے بعد حجاج نے یہ روئی محمد بن قاسم کو اس ہدایت کے ساتھ بھیجی کہ اسے پانی میں بھگو کر پکانا۔ محمد بن قاسم نے جنگ لڑ کر داہر کو قتل کیا اور سندھ فتح کر لیا۔ سندھ کا دارالحکومت بھنبھور/ بمہنو تھا۔ اہل فارس اسے ''بمناباذ'' کہتے ہیں۔ ارکند کی زیج میں اس کا نام ''برہمن آباذ'' لکھا ہے۔

جب محمد بن قاسم شہر میں فاتح کے طور پر داخل ہوا تو بولا۔ ''نصرتُ''۔ اس لیے اس شہر کا نام منصورہ پڑ گیا۔ پھر وہ ملتان کی طرف بڑھا اور اسے فتح کر لیا۔ جب وہ یہاں داخل ہوا تو بولا ''عمرتُ''۔ چنانچہ اس شہر کا نام معمورہ پڑ گیا۔ لیکن یہ نام منصورہ کی طرح معروف نہ ہوا۔ البتہ اسے ''فرج الذہب'' کے نام سے شہرت ملی۔ یہ نام ایک کمرے کی بنا پر پڑا جو دس گز لمبا اور اسی گز چوڑا تھا۔ یہ مقفل اور سربمہر تھا۔ اس کی چھت سے ایک سوراخ کے ذریعے اس میں سونا اور قیمتی اشیا داخل کی جاتی تھیں حتیٰ کہ یہ پورے طور سے بھر گیا۔ اس وقت سے ملتان کو سونے کی حد کہا جانے لگا۔

یہاں لکڑی کا ایک بُت تھا۔ اس پر سرخ چمڑا منڈھا ہوا تھا اور آنکھوں کی جگہ دو بڑے بڑے قیمتی یاقوت جڑے تھے۔ اس بت کا نام ''ادت'' تھا جو سورج کا نام ہے۔ دور دور کے شہروں سے ہندو یہاں اسے پوجنے آتے تھے اور اس پر قیمتی چیزوں اور سکوں کے چڑھاوے چڑھاتے تھے۔ محمد (بن قاسم) نے اس بت کو چھیڑا تک نہیں تاکہ ہندوؤں کو کوئی رنج نہ پہنچے لیکن المقتدر کے دور میں حکم بن شیبان نے اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیے۔ چنانچہ اس کے پجاریوں اور اس کے درمیان تنازع چھڑ گیا۔ حکم نے خزانہ بھی لوٹ لیا۔ واللہ الموافق۔

حقیقی جواہر کی قدر و قیمت

جواہر کی قیمت مستقل نہیں رہتی۔ ان کی قدر و قیمت کے تعین کا کوئی اُصول بھی موجود نہیں اور کوئی وجہ نہیں کہ ان کی قیمتیں وقت اور جگہ کے لحاظ سے بدلتی نہ رہیں۔ ہر ملک اور ہر قوم کا اپنا مزاج ہوتا ہے۔ مزید برآں ایک وقت روساء انھیں بیچنے پر تل جاتے ہیں اور ایک وقت خریداری کا رجحان بڑھ جاتا ہے۔ کبھی تو ان پتھروں کی بہتات ہو جاتی ہے اور کبھی قلت۔ اللہ کسی کو عزت دیتا ہے اور کسی کو ذلت۔ ہم ان جواہر کی قدر و قیمت کا ذکر اپنے زمانے اور حال ہی کے لحاظ سے کریں گے اور یہ غزنی اور اس کے قرب و جوار ہی کا ہوگا۔ سونے کے لیے ہم ہرات کا معیار استعمال کریں گے، کیونکہ جواہر کی قیمت اسی معیار پر بیان کی جاتی ہے۔ اگر ہمیں کوئی اور معلومات دستیاب ہوئیں تو ہم ان کا بھی ذکر کریں گے۔

متقدمین کے نزدیک یاقوت کی بہرمانی قسم کے ایک مثقال (تین گرام یا ۱۵ قیراط) کی قیمت پانچ ہزار دینار ہے۔ اس سے زیادہ قیمت کا تصور نہیں ہوسکتا۔ نصف مثقال وزن کی قیمت دو ہزار دینار ہے اور دو مثقال وزن کے بہرمانی یاقوت کی قیمت کا تعین نہیں ہوسکتا۔ یہ خریدار کے ظرف پر منحصر ہے۔

زمانۂ حال کے جوہری یاقوت کی رمانی قسم کی قیمتیں آنکتے ہیں، جو گہرے رنگ، آلایشوں سے مبّرا، صاف اور کسی قسم کے سوراخ یا مسام، بادل وغیرہ سے پاک ہوتے ہیں نیز مسطح، ہموار، مربع یا مستطیل (کہ یہی وضع قطع مقبول ہے) ہی بہترین ہیں۔ اس کے بعد مضرابی قسم ہے، اس کا نچلا حصہ سندان کی طرح ہوتا ہے۔ اس پتھر میں وہ تمام خوبیاں ہوتی ہیں۔ اس کا موازنہ ''نجمہ النجم'' سے کیا جاتا ہے۔ جسے بجا طور پر موتی (لُولُو) کہا جا سکتا ہے۔ اگر اس پتھر کا وزن ایک طسوج (جو کے دو دانے) ہو تو اس کی قیمت پانچ دینار ہے۔ اس سے دگنے وزن کی قیمت بھی دگنی ہے۔ ایک دانق وزن (نصف گرام یا ڈھائی قیراط سے زیادہ) کی قیمت ۵۰ دینار ہوگی۔ دانق سے میری مراد مثقال کا چھٹا حصہ ہے۔ دو دانق وزن کی قیمت اس کا چار گنا ہوگی۔ ایک مثقال کی قیمت ہزار دینار ہے اور ڈیڑھ مثقال کی قیمت دو ہزار دینار ہے۔

جوہریوں کا دعویٰ ہے کہ انھوں نے ایسی خصوصیات کا اتنا بڑا یاقوت نہیں دیکھا۔ نیز ایک مثقال وزن کا یاقوت نادر ہوتا ہے، جیسا کہ اس وزن کا موتی۔ ایک دانق یاقوت کی قیمت اس کے ہم وزن موتی سے زیادہ ہوتی ہے۔ عہد حاضر کے جوہریوں کے نزدیک مذکورہ بالا بہرمانی قسم رمانی قسم سے کمتر ہوتی ہے۔ اس کی قیمت آٹھ سو دینار ہے۔ ارغوانی قسم پانسو

دینار جبکہ لحمی یا گلناری سوسو دینار قیمت پاتی ہے۔ گلابی رنگ کی قسم بھی اتنی ہی قیمت رکھتی ہے۔ رمانی قسم کے استثنا کے ساتھ تمام یاقوتی اقسام شاذونادر بیس سے پچاس مثقال تک کی ہوسکتی ہیں۔ الکندی لکھتا ہے:

> میں نے سرخ قسم کا بڑے سے بڑا پتھر ڈیڑھ مثقال یا ذرا زیادہ کا دیکھا ہے۔ قصے کہانیوں میں تو ہمیں دس مثقال وزن کا ذکر بھی ملتا ہے۔ میں نے وردی قسم میں بڑے سے بڑا یاقوت تیس مثقال کا دیکھا ہے۔

نصر کہتا ہے:

> یاقوت کی خوبی اس کے رنگ کی شدت، آب وتاب کے کمال، صاف پن، چمک دمک اور نقائص سے پاک ہونے میں ہے۔

اس معیار کے پیش نظر یاقوت کی قیمت میں اضافہ ان خواص پر منحصر ہے۔ بہر مانی قسم زیادہ قیمتی ہے، اس کے بعد اصفری، جمری اور پھر وردی ہے۔ ہر کوئی جانتا ہے کہ وردی، اصفری لحمی رنگوں کی قسمیں ہیں جو کئی طرح کی ہوسکتی ہیں۔ وردی سفید ہوتی ہے۔ اس کی ایک اور نوع سرخی مائل ہوتی ہے۔ سرخی کے بتدریج زیادہ ہونے پر جونہی گالوں کی سی گلابی جھلکنے لگے جو بڑھتے بڑھتے سرخ گل لالہ کی سی اور ذرا سی سیاہی مائل ہونے لگے تو یہ حد آخر ہے۔

یاقوت کی قیمت آنکنے کے سلسلے میں لوگ مختلف مشابہتیں ڈھونڈتے ہیں۔ جو لوگ یاقوت کے خواص کا فہم حاصل کرنا چاہیں، وہ اس کی اقسام، خواص، علاقے اور خاصیتوں کا خیال رکھیں۔ میں نے عبدالملک بن مروان کے عہد کی شام میں لکھی گئی ایک کتاب میں دیکھا ہے کہ اس میں فن (جوہری) کے کئی نکات بیان ہوئے ہیں اور اس دور کی قیمتیں بھی درج ہیں۔ اس سے ظاہر ہے کہ سرخ یاقوت کی قیمت دو گھوڑوں کی قیمت کے برابر ہے[18]۔ جب ضروری ہوا اس کتاب کا حوالہ دیا جائے گا۔

یاقوت نما جواہر

یاقوت سے مشابہ ایک سرخ پتھر کرکند (تامڑ Garnet) یا ''یاقوت الاصم'' ہے[19]۔ اس کے معنی ہی سخت سرخ کلسی دونیہ (یمنی یا رومی عقیق) کے ہیں کیونکہ یہ ٹھوس، کم شفاف اور گدلا ہوتا ہے۔ یہ نوع خاکی (غباری) یاقوت سے زیادہ قیمت نہیں پاتی۔ الکندی لکھتا ہے:

> کرکند کی ایک قسم جو یاقوت سے مشابہ ہے عصفری (زرد) ہے، جسے ''سندیہ'' بھی کہا جاتا ہے۔ اس میں سے ذرا سی شعاع پھوٹتی ہے۔ چقرے کی جیب میں بعض انواع موجود ہوتی ہیں، جو نرم اور کمتر قسم کی ہیں۔ ان کے بعد ایک قسم نمک کی مانند ہوتی ہے۔ اس سے چمک دمک خارج نہیں ہوتی اور یہ کرکند کی بدترین قسم ہے۔

یاقوت کی طرح کا ایک اور پتھر بھی یاقوت کی کانوں سے دستیاب ہوتا ہے۔ یہ ''گربز'' کہلاتا ہے۔ یہ میلا اور پھوٹک لیکن خوبصورت ہوتا ہے۔ نرم ہونے کی بنا پر یہ کرکند نظر آتا ہے لیکن کرکند اسے کاٹ سکتا ہے[20]، اگرچہ کرکند اس سے زیادہ خوبصورت نہیں ہوتا۔ اس میں بھی یاقوت جیسی درجہ بندی ہوتی ہے۔ ماہر اور تجربہ کار جوہری بھی، بلا امتحان اکثر اسے یاقوت سمجھ لیتے ہیں۔

''گربز'' نہ صرف سرخ یاقوت سے مشابہ ہوتا ہے بلکہ یاقوت ہی کی مانند کئی رنگوں میں پایا جاتا ہے۔ اسے بیان

کرتے ہوئے حمزہ کہتا ہے: ''یہ جواہر کی ایک قسم ہے جو یاقوت نظر آتی ہے۔ اگرچہ یہ یاقوت نہیں ہے''۔

عربی میں اس لفظ کو ''جربز'' یا ''گربز'' لکھا جاتا ہے۔ اس لیے فریبی شخص کو ''کربز'' یا ''گرگ بزد'' کہا جاتا ہے[۲۱]۔ الکندی نے سرخ یاقوت سے مشابہ انواع کو ''افلح الاحمر'' بھی کہا ہے۔ اس سے بھی ماہرین اشتباہ میں پڑ جاتے ہیں۔ ہم نے الکندی سے جو کچھ نقل کیا ہے وہ سنی سنائی باتوں پر مشتمل ہے۔ ہمیں تسلیم کر لینا چاہیے کہ اس کی کتاب کا جو نسخہ ہمارے پاس ہے، اس میں کئی ترامیم و اغلاط ہیں۔ نصر نے مشابہ انواع کے بارے میں کہا ہے:

> کرکند کی چار قسمیں ہیں: کرکند (تامڑا)، کرکہن، جزبز (ترمری) اور بیجاذی (جو سنہری رنگت کی ہوتی ہے) آب و تاب میں سب سے زیادہ یاقوت سے مشابہ نوع سندیہ ہے۔ یہ زردی مائل سرخ ہے اور حرارت دینے پر یاقوت کی رنگت پکڑ لیتی ہے۔ بعض ملیح (نمکین) رنگت کی ہیں جو چمک نہیں رکھتیں۔ ایک قسم ابلج (ابلہ) (اوپل) ہے جو یمنی عقیق سے نرم ہونے کی بنا پر مختلف ہے[۲۲]۔
>
> یہی وہ قسم ہے جسے الکندی نے افلح کہا ہے اور جس کا ہم نے ابھی ذکر کیا ہے۔ نصر لکھتا ہے:
>
> کرکہن سرخی مائل گہری رنگت کا ہوتا ہے۔ یہ صرف دھوپ میں چمکتا ہے اور آگ پر قرار نہیں پکڑتا اور یہ زردی مائل یاقوت کی مانند نظر آتا ہے۔ یہ خلوقی (سبز)، زیتی (توتیا)، فستقی (پستئی) اور آسمانی رنگت کا ہوتا ہے۔ یہ رنگ اس وقت چمکتے ہیں جب انھیں الٹا پلٹا جاتا ہے جیسے کہ گرگٹ۔ زرد قسم زرد یاقوت کے منکوں میں شامل ہوتی ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ یہ قسم چمکدار نہیں ہوتی اور پالش نہیں پکڑتی۔ ابلج (ابلہ) (اوپل) کے علاوہ یہ تمام پتھر یاقوت کے معدن ہی سے دستیاب ہوتے ہیں۔ ابلج (ابلہ) (Opel) سراندیپ سے ملتا ہے۔ ''جزبز'' بہت چمکدار ہوتا ہے اور بہرمانی قسم سے مشابہ ہوتا ہے اور اس کی رنگت، آب و تاب کے حوالے سے ماہرین بھی دھوکا کھا جاتے ہیں۔ اسے صرف رگڑ حرارت سے پہچانا جا سکتا ہے۔ ''بیجاذی ذہبی'' لعلِ بدخشاں ہے۔ ماہرین اسے رنگت سے پہچان سکتے ہیں جس میں یاقوت کی سی تاب شاذ نظر آتی ہے۔
>
> دونوں پتھروں میں رنگوں کا فرق یوں بھی ہے کہ یاقوت صاف آگ کی مانند اور بیجاذی دھوئیں دار آگ کی مانند ہوتا ہے۔ یہی صورت کرکند (Garnet) اور ابلہ (Opel) پر صادق آتی ہے، جو یاقوت کی آب و تاب نہیں رکھتے۔ یاقوت سے زیادہ مشابہ پتھر جزبز ہی ہے اور سندیہ تو کرکند ہی ہے۔

خالص یاقوت کے حوالے سے اشتباہ کا بہترین امتحان رگڑ ہے جو دوسرے پتھروں پر زیادہ اثر انداز ہوتی ہے۔ یاقوت رگڑ سے پر متاثر نہیں ہوتا جب کہ یہ متاثر ہو جاتے ہیں۔ الکندی لکھتا ہے: ''یاقوت سے مشابہ پتھر اس سے پہلے زمانوں میں یاقوت ہی سمجھے جاتے تھے اور یاقوت ہی کی قیمت پاتے رہے ہیں''۔

ایوب الاسود البصری کرکند (تامڑا)، جزبز (ترمری) اور افلح (اوپل) خلیفہ المہدی کے پاس ہزاروں دینار میں یاقوت کہہ کر بیچتا رہا ہے۔ قبیلہ بنی سلیم کے عون العبادی نے المہدی کو ایوب کے فریب سے آگاہ کیا اور کہا:

> اگر ان مشتبہ پتھروں کو آگ پر رکھا جائے تو یہ اس کے ساتھ قائم نہیں رہ سکتے۔ سرخ یاقوت کو اگر حرارت دی جائے تو زیادہ خوبصورت ہو جاتا ہے۔

جب مہدی نے اس مشورے پر عمل کیا تو یہ مشتبہ پتھر جن میں کرکند (تامڑا) کے تین مثقال اور افلح (اوپل) کے

پانچ مثقال تھے، جل کر خاک ہو گئے۔

یاقوت اور جواہر کے قصّے

جوہریوں سے روایت ہے کہ سراندیپ کے راجا کے پاس یاقوت کا ایک مستطیل ٹکڑا چاقو کی دستی کی مانند موجود تھا۔ وہ اسے اپنے ہاتھ میں رکھتا تھا۔ اس کا وزن پچپن مثقال تھا۔ کسی نے اتنے بڑے یاقوت کا کبھی ذکر نہیں کیا۔ میں نے مندرجہ ذیل قصہ سُنا ہے:

اتنا بڑا یاقوت ایک عام پتھر کے ساتھ منسلک تھا۔ جب اسے علیحدہ کیا گیا تو یاقوت صلیب کی شکل میں برآمد ہوا۔ اسے صاف اور گرم کرنے کے بعد روم کے شہنشاہ کے پاس بھیجا گیا جس نے اسے بھاری قیمت پر خرید لیا اور اپنے تاج میں جڑا لیا۔

اس حکایت کی سند مشتبہ ہے۔ اگر یہ صحیح ہے تو اسے یوں ہونا چاہیے تھا:

کہا جاتا ہے شہنشاہ قسطنطین اعظم نے عیسائیت قبول کر لی کیونکہ اس نے آسمان میں ایک شہابیہ دیکھا۔ شہابیہ صلیب کی مانند تھا جسے شہنشاہ نے اپنے پرچم کا نشان بنا لیا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اپنے دشمنوں پر غالب آتا تھا۔ اگرچہ اس کے پاس جنگ کے لیے بڑا لشکر موجود نہیں تھا۔

کتاب اخبار الخلفاء میں مندرجہ ذیل واقعہ بیان ہوا ہے:

''ایک بار خلیفہ المتوکل نے عیدِ نوروز کے موقع پر اپنے امرا سے تحائف وصول کرنے کے لیے دربار منعقد کیا۔ ہر قسم کے قیمتی جواہر اسے پیش کیے گئے حتی کہ بال آخر اس کا طبیب جبریل بن بخت یشوع، جس کے ساتھ خلیفہ خاصا بے تکلف تھا، وہاں آیا۔ خلیفہ نے اس کے ساتھ وصول ہونے والے تحائف کے بارے میں مشورہ کیا۔ بخت یشوع نے جواب دیا کہ یہ تحائف سیپیوں کی مانند ہیں جو مچھیرے اٹھائے پھرتے ہیں۔ یہ سب کم قیمت ہیں۔ ذرا یہ دیکھیں کہ میں کیا لایا ہوں۔ یہ کہہ کر اس نے آستین اٹھائی اور طلائی کام کا ایک آبنوسی صندوقچہ نکالا۔ جب سبز حریری ریشمی غلاف ہٹایا گیا تو قیمتی پتھر سے تراشا ہوا ایک بڑا چمچہ سامنے آیا جس پر شہابی ڈیزائن چمک رہے تھے۔ چمچہ متوکل کے سامنے رکھا گیا۔ خلیفہ نے ایسی کوئی چیز اس سے پہلے نہیں دیکھی تھی۔ اس نے پوچھا کہ اس نے اسے کہاں سے حاصل کیا ہے۔ بخت یشوع نے جواب دیا کہ کچھ مہربان اور کریم لوگوں سے۔ پھر اس نے کہا یہ چمچہ میرے والد کو امام جعفر زبیدہ سے ملا تھا۔ میرے والد نے اس کا تین بار علاج کیا تھا۔ پہلی بار گلے کے مرض کے سلسلے میں جو خناق بن گیا تھا۔ میرے والد نے اس کا فصد کھلوایا اور پھر اسے منجمد کرنے کے لیے حریرہ استعمال کرنے کا مشورہ دیا۔ حریرہ ملکہ کے سامنے چینی کی ایک پلیٹ میں لایا گیا، جس میں ایک یہ چمچہ بھی تھا۔ والد کے حکم پر میں نے چمچہ اٹھا کر لبادے میں چھپا لیا۔ خادم نے مجھ سے چھیننا چاہا لیکن ملکہ نے اسے روک دیا کہ اسے زبردستی نہیں بلکہ بات چیت سے حاصل کیا جائے اور اس کے لیے دس ہزار دینار کی پیش کش کی۔ میں راضی نہ ہوا تو میرے والد نے کہا 'ملکہ عالیہ اس سے پہلے میرے بیٹے نے ایسی کوئی حرکت نہیں کی۔ اس کی پہلی چوری پر اس کی بے عزتی نہ کی جائے کہیں اس کا دل نہ ٹوٹ جائے'۔ اس پر ملکہ ہنس دی اور یوں یہ میرے پاس ہی رہا۔

اگر چہ اس کہانی میں جواہر کی تخصیص کا ذکر نہیں، لیکن اس کی چمک دمک کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ سرخ یاقوت تھا [۲۳]۔

اس پر متوکل نے مرض کے بارے میں پوچھا۔ ملکہ نے طبیب کو بتایا تھا کہ ایک خاتون نے گلے کے اس مرض کے بارے میں اسے آگاہ کیا تھا کہ یا تو وہ اس سے مر جائے گی یا بد بودم کی مریضہ بن جائے گی۔ بخت یشوع کے والد نے اسے دن بھر کا فاقہ کرایا اور شام کو سرکے میں پکائی گئی مچھلی کھجور کی شراب کے ساتھ اسے کھلائی۔ یہ امر تین روز تک دہرایا گیا اور چوتھے روز ملکہ سے کہا گیا کہ اب وہ اس عورت سے پوچھے جس نے اسے بد بودم کا مریض کہا تھا کہ وہ ملکہ کو بتائے کہ کیا اب اس کے منھ سے کوئی بُو آ رہی ہے یا نہیں۔

تیسری بار ملکہ کو مسلسل ہچکی نے گھیر رکھا تھا جو خطرناک ہو گئی تھی۔ بخت یشوع کے والد نے برتنوں کو گھما کر بجانا شروع کیا اور یوں پیدا ہونے والی گھمبیر آوازوں نے ملکہ کے دل میں خوف پیدا کیا جس سے ہچکی رک گئی۔

بنوامیہ کے آخری ایام اور عباسیوں کے آغازِ عہد میں جواہر کی ریل پیل ہو گئی تھی۔ کہا جاتا ہے کہ ظروف قیمتی پتھروں اور دھاتوں سے بنائے جاتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ امام شافعی نے کتاب **حرملہ** میں لکھا ہے کہ یاقوت اور بلور کے برتنوں کا استعمال جائز نہیں کہ ان کی قیمت سونے سے بڑھ جاتی ہے اور ان میں سونے سے زیادہ اسراف نظر آتا ہے لیکن کتاب الام میں امام شافعی کہتے ہیں کہ ان کا استعمال جائز ہے کہ شارع (رسول اکرمؐ) نے صرف سونے اور چاندی میں منع کیا ہے۔

عراق سے آنے والے ایک شخص نے بیان کیا ہے کہ ابو طاہر بن بہاالدولہ پہلے بصرہ، پھر بغداد کا حاکم تھا۔ اس کے پاس یاقوت کا ایک بڑا نگینہ تھا جسے سونے میں جڑا گیا تھا۔ وہ اسے ''جبال'' (پہاڑ) کہا کرتا تھا۔ غالباً یہ فخر الدولہ کے پاس کا تھا۔ کیونکہ یہ اسی قسم کا نگینہ تھا۔

حسن اور حسین دو بھائی تھے اور دونوں رے کے رہنے والے تھے۔ انھوں نے ذکر کیا ہے کہ امیر یمین الدولہ محمودؒ نے انھیں ایک یاقوت دکھایا تھا جو انگور جتنا بڑا تھا۔ اس کے وزن کے اندازے سے انھوں نے اس کی قیمت بیس ہزار دینار ٹھہرائی تھی۔ سلطان اس قیمت سے متفق ہوا اور بولا ''یہ نگینہ راجا تروچن پال کی ملکیت تھا۔ اس نے ایک مقامی جوہری کے ہاتھ اسے چار لاکھ دینار میں نیلام کر دیا تھا۔ کیا میرے پاس یہ بیس ہزار دینار میں بھی نہیں ہو سکتا۔ میرے لیے یہ اتنے میں بھی نکالنا مشکل ہے''۔ یہ نگینہ ڈیڑھ مثقال یا مثقال رمانی مربع تھا جسے ہم ''نجم'' کہہ چکے ہیں۔

چُلاہ مہاراجوں کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ ان کے پاس ایک یاقوت تھا جسے رکابوں کے ساتھ جوڑا گیا تھا۔ دو افراد رکابوں کا یہ جوڑا اٹھاتے تھے تاکہ راجا گھوڑے پر سوار ہوتے وقت یاقوت پر پاؤں رکھ سکے۔ وہ اسے عماری کے ساتھ پیوستہ رکھتے تھے تاکہ اس کے بعد راجا گھوڑے پر سوار ہو سکے۔

ان دونوں بھائیوں نے بتایا ہے کہ انھوں نے امیر شہید مسعود اسعد (اللہ شہادت کے باعث ان کے درجات بلند کرے) سے رے اور کوہستان میں اس کے قیام کے دوران میں ایک سرخ یاقوت سات ہزار نیشاپوری دینار میں خریدا تھا جو مستطیل اور شیر کی صورت میں تھا۔ بعض لوگ اسے ''جبل'' کہنے میں حق بجانب تھے۔ اس کا مالک ایک سیاہ وزیر تھا جو

قابوس کا بھائی تھا اور اس نے یہ نگینہ بھائی سے ورثے میں پایا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ اس کی شکل شیر جیسی تھی۔ اگر اسے مٹھی میں دبایا جاتا تو یہ انگوٹھے اور شہادت کی انگلی کے بیچ سے پھسل جاتا۔

سراندیپ کے بارے میں بھی کئی قصے مشہور ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ وہاں موجود یاقوتی کان پر بہت سخت پہرا ہوتا تھا اور کوئی شخص وہاں پہنچ نہیں سکتا تھا۔ وہاں سے پتھر چرانے والے ایک شخص نے مندرجہ ذیل طریقہ برتا تھا۔ اس نے اپنا سر منڈایا اور سر کے مطابق پیتل کا جالی نما ٹوپ پہنا۔ اس میں سر کے پیچھے پتھر رکھنے کی گنجایش رکھوائی گئی۔ اس نے یہ ٹوپی پہنے رکھی حتی کہ اس کے سر کے بال اُگ آئے اور ٹوپی اس کے نیچے چھپ گئی۔ اس نے ایک لاٹھی پکڑی اور نیم ملبوس ملنگ کی طرح دکھائی دیتے ہوئے اور لاٹھی ٹیکتے ٹیکتے پہریداروں کی نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

میں نے خوارزم میں امیر یمین الدولہ کو ہر سال تحائف پیش کیے جانے کا منظر خود دیکھا ہے۔ ان میں سے ایک تحفہ سرخ یاقوت سے بنا ہوا باز و بند تھا کہ وہ کلائی کے گرد باندھا جا سکتا تھا۔ یہ ایک سخت پتھر تھا۔ بعد میں مجھے خیال آیا کہ یہ کرکند (تامڑا) ہو سکتا ہے لیکن یقین سے کچھ نہیں کہا جا سکتا۔

یاقوت کے ان نمونوں میں سے کچھ کو ان کے حجم اور ضخامت کی بنا پر ''جبل'' کا نام دیا جا سکتا ہے [۲۴]۔ جو ایسے جواہر بھی ہو سکتے ہیں جو رمانی اور بہرمانی نوعیت کے ہوں۔

عباسی خلفا کے خزانے میں ایک بڑا یاقوت موجود تھا جو باز و بند کی طرح تھا اور جس کا مرکزہ دھندلا سا تھا۔ اس کا وزن تیس مثقال تھا۔ اسے صاف کر کے بگل کے سرے پر جڑا گیا اور اس کا نام ''عنقا'' رکھا گیا۔ تب اس کا وزن اکیس مثقال تھا اور کچھ حصہ اس کی نوک پر تھا جس کا وزن پندرہ مثقال تھا۔ کہا جاتا ہے کہ یہ سرخ یاقوت سے بنا ہوا پرندہ تھا جس کی منقار (چونچ) زرد تھی۔ یہ اپنے دور کا عجوبہ تھا۔ نصر اس کی چونچ کے بارے میں لکھتا ہے:

> یہ ایک دانق کم دو مثقال کا جوہر تھا اور یہ ''جبل'' پر رنگ اور دمک میں فوقیت رکھتا تھا۔

نصر نے اس بات کا ذکر نہیں کیا کہ اسے ''منقار'' کیوں کہا گیا۔ وہ مزید لکھتا ہے:

> مقتدر باللہ کی خالہ کے پاس ایک پتھر تھا جسے ''ورقۃ الآس'' کہا جاتا تھا کیونکہ یہ مہندی کے پتے ہی کی مانند تھا اور اس کا وزن دو گرین سے ایک مثقال کم تھا۔ اس کی قیمت ساٹھ ہزار درہم تھی۔

خلیفہ کے خزانے میں ایک اور سرخ یاقوت کسی سمندر کی مانند ترشا ہوا موجود تھا۔ اس کا وزن اٹھائیس مثقال تھا۔ یہ اتنا کھوکھلا اور گہرا تھا کہ اس میں پانی پیا جا سکتا تھا۔ ان خلفا کے خزانے میں کئی ایسے پتھر بھی ہیں جن کا کوئی نام ہو یا نہ ہو، انھیں ساسانیوں نے جمع کیا تھا اور یہ اردشیر بن بابک کے خزانے میں موجود تھے۔ وہ ایک سے دوسرے بادشاہ کے پاس، پھر عربوں کی فتوحات کے بعد ان نئے حکمرانوں کے پاس آ گئے۔

یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ چاروں خلفائے راشدین کو جواہرات سے کوئی دلچسپی نہ تھی اور وہ انھیں مسلمانوں میں تقسیم کر دیا کرتے تھے۔ یہی بات بنو امیہ اور بنو مروان کے بارے میں ہے کہ ایک دو حکمرانوں کے علاوہ ان عربوں میں

سے کوئی ان کا دلدادہ نہ تھا۔اس لیے جواہر اپنے وقت پر تقسیم ہوتے تھے اور خزانے ان سے بھرے رہتے تھے۔

پھر اچانک عباسی آ گئے وہ ٹڈی دل کی طرح اپنے ہاتھوں میں آنے والی ہر چیز چٹ کرتے گئے اور حاصل کردہ دولت پر چڑھ کر بیٹھ گئے۔ان کی نظریں جواہر پر مرکوز ہوئیں اور ان کی خواہش ہوئی کہ وہ کس طرح سے اپنے ذخیرے میں اضافہ کرتے رہیں۔حتی کہ مقتدر باللہ کا زمانہ آیا اور ذخائر بڑھ گئے۔مقتدر پر اس کی ماں کا زیادہ اثر تھا۔وہ ایسی مجلسیں منعقد کرتا تھا جو اس کے شایان نہ تھیں۔وہ ہر وقت عورتوں کی محفل میں گھرا رہتا اور لہو ولعب میں مبتلا رہتا۔وہ اپنے ہی خزانے کو ڈاکو کی طرح لوٹتا رہتا۔جب دولت ختم ہوگئی تو اس نے جواہر نکالنے شروع کیے جو اس نے اپنی ان عورتوں پر لٹانے شروع کیے۔وہ اپنے وزیر عباس سے خائف رہتا۔اسے قابو میں رکھنے کے لیے اس ڈکیتی میں شریک کرنے کی کوشش کی تا کہ وہ لالچ میں اندھا ہو جائے۔اس نے بڑی مقدار میں جواہر اسے بھجوائے لیکن عباس نے سب واپس کر دیے اور کہا ''جواہر خلفا کا ہتھیار اور زینت ہوتے ہیں۔ان کی تقسیم موزوں نہیں''۔مقتدر شرمندہ ہوا اور اس کے بعد اس پر شک کرتا رہا۔

علی بن عیسیٰ جب مکہ سے واپس ہوا جہاں وہ وزارت سے معزولی کے بعد جلاوطن تھا تو ایک بار وہ مقتدر سے ملا۔ان کی گفتگو کے دوران میں موضوع ان ظروف کی طرف مڑ گیا جو مقتدر نے ابن جصاص سے تیس ہزار دینار میں خریدے تھے۔جب علی نے ان کے بارے میں پوچھا تو مقتدر باللہ نے کہا کہ یہ خزانے میں رکھے گئے تھے۔علی نے دیکھنے کی خواہش کی۔مقتدر نے طلب کیا تو نہ ملے۔علی نے اپنی آستین سے ایک نگینہ نکالا اور کہا کہ یہ میں نے مصر میں خریدا ہے۔اگر جواہر کے یہ ساتھ یہ حال ہے تو دوسری چیزوں کا تو پھر خدا ہی حافظ ہے۔مقتدر نے اس کوتاہی کا اقرار کیا اور نگران مال زیدان کو اس کا ذمہ دار ٹھہرایا۔

مقتدر کی ماں ایک بُری ضرب المثل بن چکی ہے۔اس کا ذکر ہم آگے چل کر کریں گے۔صادق نے اس پر یوں کہا کہ:

فلا کانت الدنیا اذا سا سها النساء
وان سسن یوما فالسلام علی الدنیا

(اگر ایسی عورت حاکم ہو تو دنیا خاتمے کو پہنچ جائے۔اگر وہ ایک دن بھی اقتدار میں آئی تو دنیا پر سلام ہے)

اگر آپ صادق کے اس قول کی تصدیق کرنا چاہیں تو زبیدہ کو دیکھیں جس نے فضیلت اور ندرت میں شہرت پائی۔اس کا گلدان رمانی یاقوت سے بنا ہوا تھا۔اس کے منکے گٹھلیوں کی طرح بڑے تھے،جن پر سے تربوز کی طرح لکیریں گزر رہی تھیں۔اگر لوگ اس طرح سے کوئی یاقوت دیکھ لیتے تو کہتے کہ وہ زبیدہ کے پتھروں کی طرح ہیں۔اس کے موتی سفتہ ہوتے تھے تا کہ اس کی کنیزیں ان سے بنے ہار پہنیں۔اس کے پالتو بندر،اس کی موت،تجہیز وتکفین اور (ملکہ کا) ماتم کے قصے سب کہانیاں ہیں۔ہم اس کی حرمت کی خاطر ان کا ذکر نہیں کریں گے۔زبیدہ کے بعد اس کے قدموں کی خاک کے برابر بھی کوئی معتبر نہیں۔

مقتدر سے پہلے کے عباسی خلفا بھی جواہر صرف کیا کرتے تھے لیکن اتنا نہیں کہ تلافی نہ ہو سکے۔ ہارون الرشید کی ایک کنیز حسن میں یکتا تھی۔ ہارون الرشید جب بھی اسے تحائف دیتا تو وہ انھیں واپس کر دیتی۔ ہارون اس کے روّیے سے ناراض تھا۔ کہا جاتا ہے کہ ایک روز ہارون نے کنیزوں کو چند قیمتی جواہر دیے۔ سوائے اس مخصوص کنیز کے سب نے قبول کر لیے۔ ہارون نے کچھ اور جواہر منگوائے اور کنیزوں کو اپنی پسند کے مطابق منتخب کرنے کے لیے کہا۔ ہر ایک نے اپنی مرضی کے جواہر چن لیے۔ اس کنیز نے ایسا کچھ نہ کیا۔ آخر ہارون نے پوچھا ''اس نے کچھ منتخب کیوں نہیں کیا؟''۔ کنیز نے جواب دیا ''میرے آقا! اگر ایسا کرنا لازم ہے تو ضرور.....'' یہ کہہ کہ وہ کھڑی ہوگئی۔ آگے بڑھی اور ہارون کا ہاتھ پکڑ کر کہنے لگی ''دنیا کے جواہر میں یہ جوہر سب سے زیادہ قیمتی ہے جو میں نے منتخب کیا ہے''۔ ہارون بے حد خوش ہوا اور اس نے کنیز خالصہ کو چوم لیا۔ اس روز سے وہ اسے سب سے زیادہ تحائف دینے لگا۔ ابونواس کو ہارون سے کوئی انعام ملے ایک عرصہ ہوا تھا۔ اس نے یہ شعر کہا:

لقد ضاع شعری علی بابکم
کما ضاع در علی خالصه

(میرا شعر تیرے دروازے پر یوں ضائع ہو رہے ہیں جیسے خالصہ کے ہاں جواہر سب قدر و قیمت کھو بیٹھتے ہیں)۔

جب خالصہ نے یہ شعر سنا تو اس نے ہارون الرشید سے شکایت کی۔ ہارون نے ابونواس کو بلا بھیجا اور کہا ''اے فاسق! تو نے یہ جرأت کیسے کی؟''۔ ابونواس نے کہا کہ یہ غلطی تو بیان کرنے والے کی ہے جس نے مصرعے میں موجود ہمزہ (ء) کو عین (ع) میں بدل دیا ہے۔ ہارون نے مان لیا۔ اس جیسا شعر و ادب کا ذوق رکھنے والا کیسے اپنی ناراضی دور نہ کر دیتا۔ زبان و ادب میں ہارون الرشید کو فریب دینا آسان بھی نہ تھا۔

ایسا ہی ایک واقعہ خلیفہ عمرؓ بن الخطاب کا ہے۔ انھوں نے حطیہ کے ہجو کو نظر انداز کر دیا جو ایک صحابی زبرقان کے بارے میں تھی۔ حسانؓ بن ثابت نے دخل دینا چاہا لیکن حضرت عمرؓ نے از راہ ترحم شاعر کی زبان بند کرنا چاہی۔ حضرت عمرؓ اور دوسرے شرفا کو رسول اکرمؐ کی یہ حدیث یاد رہتی ہے کہ شاعر کا مون※ ھ مہربانی کے ذریعے بند کرو۔ خلیفہ عمرؓ ایسے شاعروں سے اغماض برتتے جو لایعنی بکواس کرتے تھے۔ معتضد کے وزیر عبیداللہ نے علی بن بسام کے ساتھ ایسا ہی کیا جب وہ اس کے ایک بیٹے کی موت پر بولا:

قل لأبی القاسم المرجی
قا بلک الدهر با لعجائب
مات لک ابن و کان زینا
و عاش ذ و النقص و المعائب
حیا هذا کموت هذا

فلست تخلو من المصائب

(ابوالقاسم سے زمانے کے عجیب مدوجزر نے پوچھا۔تمھارا قابل بیٹا تو مر گیا اور تجھ جیسی عیبی مخلوق زندہ ہے۔اس کے بعد تیری زندگی موت سے بدتر ہے دراصل تو بہت ہی بدقسمت ہے)

جب عبیداللہ نے یہ اشعار سنے تو اس نے علی بن بسام کو بلا بھیجا اور پوچھا کہ اس نے یہ اشعار کیوں کہے۔بات کو طول دینے کی بجائے علی بن بسام نے یہ اشعار پڑھے:

قل لأبی القاسم المرجی
لن یدفع الموت کف غائب
لئن تولی بما تولی
و فقده اعظم المصائب
لقد تخطت لک المنایا
عن حامل عنک للنوائب

(کہو ابوالقاسم انسانوں کی امیدیں موت کو دفع نہیں کرسکتیں۔جو گیا وہ گیا اس کا جانا بڑی مصیبت ہے۔موت تجھے چھوڑ کر تیرا متبادل لے گئی)۔

یہ خیال بسام نے ابن المعتز سے لیا جس نے عبیداللہ کے بیٹے کی موت پر مندرجہ ذیل اشعار کہے۔

قل للوزیر کذا الزمان و صرفه
والمرء ذوأجل بصیر الیه
فلقد غبنت الدهر اذشاطرة
بأبی الحسین و قد ربحت علیه
وأبو محمد الجلیل مصابه
لکن یمین المرء خیر یدیه

(وزیر کو بتائیں کہ زمانہ اور اس کا عمل ایک سا ہے اور ہر ایک کا موت کا وقت مقرر ہے۔زمانے کے شاطر نے ابو الحسین کی قسمت طے کردی تھی اور ابو محمد جیتنے والوں میں نہیں تھا)

جب علی بن بسام عبیداللہ کے دربار سے رخصت ہوا۔اس نے اپنی طبیعت کے موافق یہ اشعار کہے:

ابلغ وزیر الأمیر عنی
و ناد یاذا المصیبتین
یموت خلف الندی و یبقی
خلف المجازی أبوالحسین
فأنت من ذا عمید قلب
وانت من ذا سخین عین
حیاة هذا کموت هذا
فالطم علی الرأس بالیدین

(وزیر کو یہ بات پہنچا دو اور کہو کہ تو نے دوہری مصیبت نہیں دیکھی؟ تیرا خلف مر گیا اور باقی خلف مجازی ابوالحسین رہ

گیا۔اس کے دل پر بہت بوجھ ہے۔یہ زندگی بھی موت کی طرح ہے۔اس لیے اپنے سر کو اپنے ہاتھوں سے پیٹ۔)
اس کے پہلے اشعار ضرب المثل بن کر مشہور ہوئے۔لوگ انھیں پڑھتے اور شطرنج کھیلتے ہوئے بولتے۔ابن حمدون لکھتا ہے:
''ایک روز میں معتضد باللہ کے ساتھ شطرنج کھیل رہا تھا۔عبیداللہ اس کے پاس کسی کام کی اجازت کے لیے آیا اور چلا گیا۔اس کے جانے کے بعد معتضد نے ہجو کا یہ مصرع پڑھا:

حیاۃ هذا کموت هذا

(اس کی زندگی اس کی موت کی طرح ہے)

وہ اسے گنگناتے ہوئے گوٹیاں پھینک رہا تھا۔عبیداللہ ابوالقاسم دوبارہ کسی کام سے واپس آیا۔معتضد اس سے غافل تھا اور یہ ہجو پڑھ رہا تھا۔میں نے کسی ترکیب سے اسے کمرے میں عبیداللہ کے وجود سے آگاہ کیا۔معتضد نے اپنا سر اوپر اٹھایا اور کمرے میں عبیداللہ کو دیکھا۔معتضد اتنا شرمندہ ہوا کہ شرمساری اس کے چہرے سے عیاں تھی۔بالآخر وہ بولا:''اے ابوالحسین،تم اس ذلیل شاعر کی زبان کاٹ کیوں نہیں دیتے''۔عبیداللہ نے موقع غنیمت جانا اور اپنے گھر واپس چلا گیا۔اس نے پہلی فرصت میں ابن بسام کو اپنی تسلی کی خاطر کے لیے بلا بھیجا۔جب میں نے یہ سنا تو ڈر کے مارے کانپ اٹھا۔میرے ہاتھ مفلوج ہو گئے اور زبان لڑکھڑانے لگی۔مجھے یہ خوف ہوا کہ ابن بسام کو سزا ملے گی۔جب معتضد نے اس بارے میں پوچھا تو میں نے کہا''یا امیر المومنین!ابوالقاسم اپنی آگ میں جل رہا ہے اور مجھے خوف ہے کہ وہ اس جوش میں بسام کی زبان کاٹ دے گا۔بسام ایک بڑا شاعر ہے اور اگر ایسا ہوا تو یہ آپ کے لیے بدنامی کا سبب ہوگا''۔خلیفہ نے ابوالقاسم کو بلا بھیجا اور پوچھا کہ اس نے ابن بسام کے ساتھ کیا سلوک کیا؟ابوالقاسم نے کہا کہ اس نے اپنے ایک دوست کو ابن بسام کی زبان کاٹنے کے لیے بلا بھیجا ہے۔خلیفہ نے فی الفور یہ کہا''ہماری تمنا ہے کہ تم اس پر مہربان اور مشفق نظر آؤ تاکہ وہ ہجو کی بجائے مدح کہنے لگے''۔ابوالقاسم نے جواب دیا''یا امیر المومنین!آپ اس سے بخوبی آگاہ ہیں۔آپ نے خود یہ ہجو سنی ہے اور آپ ہی نے مجھے اس کی زبان کاٹنے کے لیے کہا ہے''۔معتضد ہنسا اور بولا''ایسے ہی لوگوں کی بنا پر ہم نے بحیرہ کو تباہ و برباد کیا ہے۔اسے بلاؤ اور تین سو دینار کا عطیہ دو۔ہمارے لیے اس کی زبان کاٹنے کی بجائے یہ بہتر ہوگا''۔عبیداللہ نے ایسا ہی کیا۔شاعر کو دولت دی اور اسے میمرہ کی ڈاک پر منتظم بنا دیا جہاں وہ معتضد کے آخری ایام تک متمکن رہا۔

معتضد نے بحیرہ کے وقوعے کا ذکر کیا تھا۔خلیفہ نے باغوں سے گھری ایک عمارت تعمیر کرنے کا حکم دیا۔وہ اس پر ساٹھ ہزار دینار صرف کر چکا تھا اور وہاں وہ اپنی رقاصوں کے ساتھ رہنے لگا تھا۔ان میں سے ایک ذریرہ تھی۔بسام نے اس پر یہ شعر کہا تھا:

ترک الناس بحیره
وتخلی فی البحیره
قاعد ایضرب بطبل
علی حر ذریره

(سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر تم نے بحیرہ میں پناہ لی۔وہاں بیٹھ کر تم نے ذریرہ کے ساتھ تنبورہ بجایا)

جب یہ اشعار معتضد نے سنے تو اس نے ان سنی کر دی۔اس کی بجائے اس نے عمارت گرانے کا حکم دے دیا۔

ہم''**جبل**''کے بارے میں اپنے سابقہ بیان کی طرف آتے ہیں،جو ایسا مقبول عام جوہر تھا کہ بعد میں اس کے نام پر کئی اور جواہر کو یہ نام ملا۔یہ خوبصورت سرخ یاقوت تھا۔ابراہیم بن المہدی کہتا ہے کہ اس نے یہ نگینہ اپنے باپ سے تیس

ہزار دینار میں خریدا تھا۔ یہ پہاڑ کی طرح تہ دار تھا۔ مہدی نے بطور تحفہ یہ ہادی کو دیا۔ اس نے بدلے میں ہارون الرشید کو ایک انگشتری دی جس کا نام ''اسماعیلی'' تھا۔ اس میں دنیا کا ایک نادر زمرد جڑا ہوا تھا۔ اس نگینے میں ایک سوراخ تھا۔ ایسا ہی کوئی اور ٹکڑا بہت تلاش کیا گیا تا کہ اس سوراخ کو بھرا جا سکے۔ بال آخر اسے مطلوبہ جوہر مل گیا۔ سنار نے اس کی موجودگی میں انگشتری وضع کی اور کسی گوند کے ساتھ ٹکڑا اس میں چسپاں کیا گیا۔

ایک روز ہارون اپنی ہتھیلی پر رکھ کر اس انگوٹھی کو دیکھ رہا تھا تا کہ وہ اصل اور جوڑ کے ملاپ کو جانچ سکے۔ ایک مکھی انگشتری پر آن کر بیٹھی اور پھر اُڑ گئی۔ کچھ برادہ اس کی ٹانگوں سے چپک گیا۔ اس پر ہارون الرشید بولا: خدا نے سچ کہا ہے ''ضعف الطالب والمطلوب'' (طالب اور مطلوب دونوں کمزور ہیں)۔

جب ہادی خلیفہ بنا اور ہارون اس کے پاس آیا تو ''اسماعیلی'' ہارون کی انگلی میں تھی۔ ہادی نے جل کر سوچا کاش یہ انگوٹھی اس کے قبضے میں آ جائے جیسا کہ ''جبل'' اس کے پاس ہے۔ جب ہارون دربار سے اٹھا تو ہادی نے فضل بن ربیع کو حبشی اسماعیل کے ساتھ ہارون سے وہ انگوٹھی لینے کے لیے بھیجا کہ اگر وہ دینے سے انکار کرے تو اس کا سر قلم کر دیا جائے۔ فضل بن ربیع ہارون سے ملا اور اپنا مقصد بیان کیا۔ ہارون نے قسم کھائی کہ وہ یہ انگوٹھی اپنے ہاتھ سے ہادی کو دے گا۔ یہ کہہ کر وہ فضل بن ربیع کے ساتھ واپس ہوا اور جب وہ پل پر پہنچے تو ہارون نے اپنی انگلی سے انگوٹھی اتاری اور فضل بن ربیع کو پکار کر کہا ''فضل تم خود دیکھ لو کیا یہ ''اسماعیلی'' ہے؟'' فضل نے اثبات میں جواب دیا۔ ہارون نے اسے دجلہ میں پھینک دیا۔ ہادی نے اپنی ساری طاقت لگا دی لیکن وہ اسے برآمد نہ کرا سکا۔

جب ہارون نے ہادی سے تخت واپس لیا اور اس پر ایک سال گزر گیا تو ہادی کی تلاش کی یاد اسے ستانے لگی۔ اس نے فضل بن ربیع کو انگوٹھی تلاش کرنے کے لیے کہا۔ فضل بن ربیع نے کہا کہ تلاش کی کئی کوششیں کی جا چکی ہیں اور شاید اب تک یہ چار گز ریت کے نیچے دھنس چکی ہے۔ تاہم فضل نے غوطہ خوروں کی ایک اور ایک ٹیم کو انگوٹھی کی تلاش پر مامور کیا۔ ایک غوطہ خور نے فضل بن ربیع سے کہا کہ وہ اس جگہ پر کھڑا ہو جائے جہاں امیر المومنین کھڑے ہوئے تھے۔ فضل نے ایسا ہی کیا۔ غوطہ خور نے اسی سمت میں غوطہ لگایا اور تہ تک پہنچا۔ تلاش بسیار کے بعد بال آخر وہ انگوٹھی تلاش کر لایا۔ ہارون ''جبل'' اور ''اسماعیلی'' انگوٹھی دونوں کا مالک بن گیا۔ ہادی نے بھی دونوں کے لیے کوشش کی تھی لیکن قسمت نے دوسرے کی یاوری کی۔ نصر نے کہا ہے کہ ''جبل'' انگوٹھی کا پتھر سرخ بہرمانی لیکن زردی مائل تھا اور اس کا وزن ایک دانق کم تین مثقال تھا۔ اس کی قیمت ایک ارب دینار تھی [۲۵]۔

ہارون جواہر جمع کرنے کا بے حد شائق تھا۔ اس نے جوہری صباح کو سراندیپ کے راجا کے پاس جواہر کی خریداری کے لیے بھیجا۔ راجا نے گرم جوشی سے اس کا استقبال کیا اور اسے اپنے جواہر کے خزانے میں لے گیا۔ صباح نے پتھروں کا بغور معائنہ کیا۔ انھیں الٹ پلٹ کر دیکھا۔ وہ ان پتھروں کی خوبصورتی اور ہم آہنگی سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا اور

بال آخر وہ سرخ یاقوت کے ذخیرے پر پہنچا۔ ایسے پتھر اس نے شاہی خزانوں میں نہیں دیکھے تھے۔ اس پر وہ بے حد حیران تھا۔ راجا اس کی حیرت کو دیکھ رہا تھا اور پوچھا کہ کیا اس نے ایسا یاقوت کہیں دیکھا ہے۔ جوہری نے نفی میں جواب دیا۔ اس پر راجا نے کہا ''کیا تم اس پتھر کی قیمت آنک سکتے ہو؟ کیونکہ ہمارے جوہری تو ناکام ہو چکے ہیں؟''۔ صباح نے بڑی ملائمت سے کہا ''کیوں نہیں جناب!'' اس پر راجا غضبناک ہوا اور بولا ''میں تمھیں عقلمند شخص سمجھ کر یہاں لایا تھا لیکن میں سمجھتا ہوں کہ میں غلطی پر تھا کیونکہ تم نے ایک ایسا دعویٰ کیا ہے جسے کوئی پورا نہیں کر سکا''۔ اس پر صباح نے جواب دیا ''آپ غلطی پر نہیں۔ اگر آپ میرے دعوے کو پرکھنا چاہتے ہیں تو از راہ کرم اپنے جوہریوں کو جمع کر لیں''۔ راجا نے ایسا ہی کیا۔ صباح نے فرش پر ایک چادر پھیلائی اور چار جوہریوں سے اس کے چاروں کونے پکڑ کر اٹھانے کے لیے کہا۔ پھر اس نے یاقوت کو زور سے اس چادر کی طرف اچھالا۔ وہ چادر پر گرا۔ راجا کی طرف مڑ کر صباح بولا ''اس کی قیمت اتنی ہے جتنا سونا میرے اور انگوٹھی کے درمیانی فاصلے میں بھرا جائے۔ اس تحفے نے راجا اور اس کے لوگوں کو خوش کر دیا۔ راجا نے حکم دیا کہ صباح کا مونھ بہترین جواہر کے ساتھ بطور انعام بھر دیا جائے۔

سلامی نے لحام کے حوالے سے لکھا ہے کہ ابو بشر السرافی سراندیپ میں اپنے ماموں کے ہاں تھا۔ وہ ایک یاقوت لایا اور اس سے پھوٹنے والی روشنی میں کتاب کا مطالعہ کیا۔ راوی نے اس بیان پر حیرت کا اظہار کیا ہے۔ اس کے نزدیک ایسا ناممکن ہے۔ کیونکہ رات کے وقت روشنی کے کسی خارجی منبع کے بغیر پتھر سے روشنی پھوٹنا ممکن نہیں۔ یہ پتھر سادہ نصف کروی شکل کا تھا اور اس کی روشنی کتاب کے لفظ پر پڑتی ہوگی۔ عدسہ بھی رات کو اتنی روشنی ظاہر کر سکتا ہے جس سے چھوٹے الفاظ نظر آ سکیں۔ کیوں کہ الفاظ بڑے ہو جاتے ہیں اور سطور کے درمیان جگہ وسیع ہو جاتی ہے۔ درحقیقت عدسہ ساز یہی پیمانہ اپناتے ہیں[۲۶]۔

''اسماعیلی'' انگشتری کی طرح ایک اور کہانی موجود ہے۔ امیر یمین الدولہ بلخ کے جنگل میں شکار کی ایک مہم پر نکلا۔ راستے میں اسے بخارا کا ایک بھکاری ملا۔ امیر ایسے لوگوں سے بہت چڑتا تھا۔ اس نے بھکاری کو دفع کرنے کے لیے کہا۔ جب وہ اپنے ہاتھ کے اشارے سے ایسا حکم دے رہا تھا تو اس کی انگوٹھی کا مرکزی نگینہ نکل کر گر پڑا۔ بھکاری یہ سب دیکھ رہا تھا۔ جب امیر کا لشکر وہاں سے چلا گیا تو بھکاری نے وہ نگینہ اٹھا لیا۔ واپسی پر امیر نے انگوٹھی کو خالی پایا۔ اس نے اس کی تلاش کا حکم دے دیا۔ اگلے روز شکار سے واپسی پر اس نے بخارا کے بھکاری کو اسی جگہ پایا۔ اس نے پھر صدا بلند کی تو امیر نے اس کے سر کو سوئیوں سے چھید دینے کا حکم دیا۔ اس پر بخارا کا یہ شخص بولا:

اگر تم اپنی ملکیت میں سے مجھے کچھ دینا نہیں چاہتے نہ سہی، کم از کم مجھ سے وہ چیز تو لے لو جو تمھاری ہے۔

اس کے بعد اس نے نگینہ امیر کو پیش کر دیا۔ امیر نے حیرت زدہ ہو کر پوچھا کہ اس کے پاس کیسے آیا؟۔ بھکاری نے سارا واقعہ بیان کیا۔ اس پر امیر بولا:

خدا کی مرضی یہی تھی کہ میں یوں تیرے آگے نگوں ہو جاؤں۔

پھر اس نے بھکاری کو تین سو دینار ادا کرنے کا حکم دیا۔ امیر نے بھکاری سے کہا ''یہ دولت لے لو اور میرا شکریہ مت

ادا کرنا۔ یہ اللہ کی طرف سے عطیہ ہے میری طرف سے نہیں۔ اگر یہ میرا عطیہ ہوتا تو یہ تم تک کبھی نہ پہنچتا''۔

ایسا ایک عجیب قصہ فراوہ کے شرابی احمد بن حسن الیزیدی کا ہے۔ وہ ہر وقت شراب میں دھت رہتا تھا۔ جب وہ جرجانیہ، خوارزم کی چراگاہوں میں ایک بار شراب پی رہا تھا، اس کی انگوٹھی کا نگینہ نکل کر گر پڑا۔ اسے اگلے روز تک اس کی کوئی خبر نہ تھی۔ الیزیدی یہ بھی بھول گیا کہ وہ کہاں بیٹھا رہا تھا۔ دو سال گزر گئے حتیٰ کہ کسی نے ایک روز اس کے دروازے پر دستک دی اور کہا کہ اس کا کھویا ہوا نگینہ فقیہ اخشیدی خطیب نے بھجوایا ہے۔ اس نے دیکھا تو یہ وہی نگینہ تھا۔ اگلے روز الیزیدی اخشیدی کے پاس گیا اور پوچھا کہ یہ اسے کیسے ملا؟ اخشیدی اینٹوں کے دو بھٹوں کا مالک تھا۔ مزدور پکانے کے لیے اینٹیں جمع کر رہے تھے کہ ایک اینٹ گری اور ٹوٹ گئی۔ اس میں سے یہ نگینہ نکلا جس پر الیزیدی کا نام کندہ تھا۔

اب ہم ایک ذرا مختلف قصہ بیان کریں گے۔ جب مامون الرشید خراسان سے بغداد آیا۔ فضل بن ربیع نے اسے ایک یاقوت پیش کیا کہ اس کی مانند کوئی اور نگینہ نہ تھا۔ مامون الرشید نے اس کا بغور معائنہ کیا۔ اسے الٹ پلٹ کر دیکھا اور اپنے ساتھیوں سے کہا کہ اس نے ایسا نگینہ پہلے کبھی نہیں دیکھا۔ پھر بولا:

> جب ابومسلم نے زیاد بن صالح کو چین بھیجا تو اس نے وہاں سے ابومسلم کو ایک پتھر ارسال کیا جو اس نے ابوالعباس السفاح کو بھیج دیا۔ سفاح نے یہ عبداللہ بن علی کو دے دیا۔ اس سے یہ مہدی کو پہنچا اور اس سے (مامون) رشید کو۔ ایک دن رشید کمان پر تانت باندھ رہا تھا اور اس کے لیے کمان کو دہرا کر رہا تھا کہ نگینہ اس کی انگوٹھی سے نکل گیا۔ رشید کو اس سے بہت دکھ ہوا۔ نماز کے وقت امام نے خلیفہ کے دکھ کو محسوس کیا۔ اس نے ایک خوبصورت پتھر بیس ہزار دینار میں خریدا اور اسے بھیج دیا۔ خلیفہ تب بھی مطمئن نہ ہوا۔ جب اس نے نگینے کو دیکھا تو بولا کہ یہ اس کے مقابل کیسے ہو سکتا ہے جو میں نے کھویا ہے، یہ کہانی سنا کر مامون بولا ''میں اس غیر اہم پتھر کو بیکار بنا دوں گا'' اور یہ کہہ کر پتھر فضل بن ربیع کو واپس کر دیا۔ اس نے پیامی کو یہ کہا ''ابوالفضل سے کہہ دینا کہ ابوالعباس (ابوالفضل) کے دن بیت چکے۔

جب پتھر ابوالفضل کے پاس پہنچا تو وہ خاموش رہا اور بعد میں اپنے کسی معتمد سے کہنے لگا کہ مامون ایک سال سے زیادہ زندہ نہ رہے گا۔ یہ خبر شام سے پہلے مامون تک پہنچی لیکن اس نے یہ بات کسی پر فاش نہ کی۔ جب عباس بن مصیب مرا تو مامون نے اس کے جنازے میں شرکت کی۔ باب الشام کے مقام پر فضل بن ربیع کے ایک بیٹے سے اس کی ملاقات ہوئی۔ وہ کچھ کہنے لگا تو خلیفہ نے اسے پاس بلایا اور اس کے کان میں بولا ''ابوالعباس (ابوالفضل) سے کہنا کہ وقت گزر چکا''۔

عمر بن عبدالعزیز اگرچہ دنیا اور اس کے مال سے گریز کرتے تھے لیکن وہ دنیاوی اشیاء کے معاملے میں ذرا مختلف تھے۔ ان کے پاس قیمتی جواہر ہوتے تھے اور ان کی حفاظت کی جاتی تھی۔ کئی قیمتی پتھر سرکاری خزانے میں محفوظ تھے۔ انھیں پتا چلا کہ ان کے بیٹے عبداللہ نے ایک پتھر ایک ہزار درہم میں خریدا ہے۔ تو انھوں نے اسے لکھا:

> مجھے خبر ملی ہے کہ تم نے ایک انگوٹھی خریدی ہے جس کا نگینہ ایک ہزار درہم کا ہے۔ میں تم کو حکم دیتا ہوں کہ اسے ترک کر دو اور بیچ دو۔ اس سے حاصل ہونے والی رقم سے ایک ہزار بھوکوں کو کھانا کھلاؤ اور اپنے لیے چاندی کی ایک انگوٹھی بنواؤ جس کا نگینہ بھی چاندی ہو۔ اس پر کندہ ہو:

رحم اللّٰہ امراء اعرف قدرہ ففعل ما امرہ بہ
(خدااس پر رحمت کرے جس نے خود کو پہچانا۔)

عبداللہ نے باپ کے حکم کی تعمیل کی۔ ہم رشید کے دروازے اور محل کے درمیان گمشدہ نگینے کی طرف آتے ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ کسی نے وہاں سے اٹھالیا ہو یا کسی پرندے یا عقاب نے گوشت کا پارچہ سمجھ کر نگل لیا ہو۔ عبداللہ بن مروان بن محمد کے پاس ایک سرخ نگینہ تھا جس کی قیمت ایک ہزار دینار تھی۔ اسے انگوٹھی میں جڑا گیا تھا۔ نوبہ سے پیدل واپس آتے ہوئے وہ یہ پکار رہا تھا'' کاش میرے پاس اس انگوٹھی کی بجائے کوئی جانور ہوتا کہ میں اس پر سوار ہوسکتا''۔ اہل مروان میں سے کسی اموی نے کہا:

جب ہم (عباسیوں سے) بھاگے تو ایسے جواہرات ہمارے لیے بے حد مفید ثابت ہوئے جو پانچ دینار سے کم قیمت تھے۔ ہم کسی ملازم یا لڑکے کو دے کر خوراک اور اشیائے ضرور یہ خریدنے کے لیے بھیجتے۔ ہم قیمتی جواہر ظاہر کرنے کی جرأت نہ کرسکتے تھے کہ کہیں ان کی موجودگی ہمارے لیے کسی فائدے کی بجائے نقصان کا باعث نہ بنے۔

یاد رہے کہ یزدگرد اپنے جواہرات سے مستفید نہ ہوسکا تھا جو اس کے جسم کے گرد پیٹی میں لگے تھے اور وہی اس کی موت کا سبب بن گئے۔ آٹے کی چکی کے ایک مالک نے اس سے چار درہم مانگے تھے اور اس کے جواہرات دیکھ کر اسے چکی کے نیچے ہی کچل دیا۔ یہی وجہ ہے کہ ہر مجوسی اب اپنے پاس کم از کم چار درہم ضرور ہی رکھتا ہے۔ یہ سبق انھوں نے یزدگرد کے قتل سے سیکھا ہے۔ نصر لکھتا ہے کہ امیر نوح بن منصور سامانی کے پاس دو انگوٹھیاں تھیں۔ ایک کا نام ''خربوزہ'' تھا جس میں انگور کے برابر سرخ یاقوت جڑا تھا اور دوسرے میں اسی شکل کا ہیرا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ لوگوں نے اتنا بڑا پتھر اس سے پہلے نہیں دیکھا تھا۔

مسلمان سلاطین نے کعبہ کو ہمیشہ عظیم گردانا ہے اور حضرت عبدالمطلب کی پیروی میں وہاں قیمتی چیزیں بھجواتے رہے ہیں۔ جب حضرت عبدالمطلب نے زم زم کے کنویں کی کھدائی کروائی (جو بند کیا گیا تھا) تو دو چمکدار تلواریں برآمد ہوئی تھیں۔ یہ کعبے کے دروازے پر آویزاں کی گئیں۔ ایک دروازے کے باہر اور ایک اندر کی طرف۔ رسول اکرمؐ نے بھی ایسا ہی کیا۔ آپؐ کو بادان فارسی نے یمن میں اسلام قبول کرنے کے بعد مجوسیوں کی سنہری کتاب بھجوائی تھی جو کعبہ میں لٹکائی گئی۔ بادان نے زرتشت کی یہ کتاب آنحضورؐ کو اس یقین دہانی کے لیے بھجوائی کہ وہ اپنے اجداد کا دین ترک کرچکا ہے۔

حضرت عمرؓ بن خطاب نے بھی اسی سنتِ رسولؐ کی پیروی کی۔ مدائن کی فتح سے حاصل ہونے والے قیمتی پتھروں سے بنے ہوئے دو چاند، دودھ کا برتن اور دو پیالے ان کی خدمت میں پیش کیے گئے۔ انھوں نے یہ کعبہ میں جمع کرادیے۔ ان سب پر قیمتی جواہر اور زبرجد جڑے ہوئے تھے۔ یزید بن معاویہ نے بھی دو قیمتی ہلال جو اس سے پہلے دمشق کے کلیسا میں تھے، کعبہ بھجوائے تھے۔ یہ سرخ رمانی یاقوت سے سجے ہوئے تھے۔ ہر ہلال ایک لاکھ دینار قیمت کا تھا۔ ان ہلالین کے ساتھ دو پیالے تھے۔ ایک عقیق سے بنا ہوا اور دوسرا ہلوری نیز عقیق اور یاقوت سے بنی دو بوتلیں بھی تھیں۔ عبداللہ بن زبیر نے کعبے کے دروازے پر سونے کے پترے چڑھوائے تھے۔

عبدالملک بن مروان نے دو صراحیاں اور دو بلوری پیالے کعبے میں رکھوائے اور درمیانی ستون پر سونا چڑھوایا۔ ولید بن عبدلملک نے بھی دو پیالے بھجوائے لیکن کتابوں میں یہ احوال نہیں ملتے کہ یہ کس چیز سے بنے تھے۔ سفاح کے پاس زبرجد کی ایک سبز پلیٹ تھی جو اس نے چار ہزار دینار میں خرید کر بھجوائی تھی۔ جبکہ ابوجعفر منصور نے فرعونوں کی ایک بوتل چاندی کی طشتری کے ہمراہ بھجوائی جو اسے روم کے بادشاہ نے پیش کی تھی۔ مامون نے سونے اور چاندی کے مجسمے بھجوائے تھے جو کابل کے سپہ سالار سے اس کے مسلمان ہونے کے بعد حاصل ہوئے تھے۔ ان کے ہمراہ یاقوت تھے جو کعبے کے سامنے حج کے دوران میں لٹکائے جاتے تھے۔ متوکل نے سونے کی ایک صراحی بھجوائی جو موتیوں، یاقوت اور زبرجد سے سجی تھی۔ یہ بھی حج کے دوران ہی میں لٹکائی جاتی تھی۔

معتز کی ماں قبیحہ نے کئی اقسام کے جواہر، پتھر جمع کر رکھے تھے جن میں کوئی بھی دنیاوی یا مذہبی مقصد کے لیے استعمال نہ ہوا۔ وہ اس وقت بھی اپنے بیٹے کی مدد نہ کر سکی جب اس سے ترکوں نے صالح بن وصیف کے قتل کے لیے پچاس ہزار دینار طلب کیے تھے تا کہ وہ اس کے شر سے محفوظ رہ سکے۔ معتز نے اپنی والدہ سے التجا کی لیکن اس بدقسمت ماں نے جواب دیا کہ اس کے پاس کچھ نہیں۔ جب صالح نے معتز کو قتل کر دیا تو اس نے خلیفہ کی ماں کے زیرزمین صندوقچے سے تین تھیلے برآمد کیے۔ ایک تھیلے میں ایک ملوک (نو پاؤنڈ) زمرد تھے۔ جواہر کا اتنا بڑا ذخیرہ نہ تو متوکل اور نہ کسی اور حکمران نے کبھی جمع کیا تھا۔ دوسرا تھیلا چھوٹا کوئی نصب ملوک وزن کا تھا۔ اتنے بڑے بڑے جواہر بھی کسی نے کبھی حاصل نہیں کیے تھے۔ تیسرا تھیلا نصف کیلیجہ (۱۳۵۰ گرام) کے برابر تھا۔ اس میں سرخ یاقوت تھے۔ ان جیسے جواہر اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھے گئے۔ صالح کو بتایا گیا کہ ان جواہر کی قیمت دس لاکھ دینار تھی۔ ان کے علاوہ بھی کئی جواہر تھے جو دس لاکھ دینار ہی کی قیمت رکھتے تھے۔ یہ ساری دولت اس عورت نے اپنے لالچ اور حماقت کی بنا پر کھودی اور نتیجے میں اس کا بیٹا ذلیل ہو کر مارا گیا۔ ذلتیں اٹھانے کے بعد اور صالح کو کوستے ہوئے وہ حج کرنے چلی گئی۔

بعض جواہر کی تفصیلات معلوم نہیں۔ کہا جاتا ہے کہ خراسان کے ایک حاکم نے ساسانی شہنشاہ سے کھجور کا ایک طلائی درخت حاصل کیا تھا۔ اس کے تنے کے ساتھ قیمتی جواہر کھجوروں کی طرح لٹکے ہوئے تھے۔ اس نے یہ درخت مصعب بن زبیر کو بھجوایا۔ اس کی قیمت بیس لاکھ دینار آنکی گئی تھی۔ مصعب بن زبیر نے اپنے حواریوں سے پوچھا کہ یہ تحفہ کس کے شایانِ شان ہے۔ سب نے یک زبان ہو کر کہا ''آپ ہی اس کے حق دار ہیں۔ اسے اپنے بیٹے کے لیے رکھ لیں''۔ مصعب بن زبیر نے کہا ''نہیں! میں یہ اسے دے دوں گا جو ہم پر مہربان ہے۔ یہ عبداللہ بن ابی فروہ کو بھیج دیا جائے''۔ اس نے یہ تحفہ قبول کر لیا۔ جب مسلمان فوجیں نہاوند میں داخل ہوئیں تو انھوں نے مالِ غنیمت سائب کے پاس جمع کرانا شروع کیا جو اس ذمہ داری کے لیے متعین کیا گیا تھا۔ ہربذ نے حذیفہ بن الیمان کو بلایا اور اس سے کہا ''اگر آپ جان کی امان دیں تو میں آپ کو وہ کچھ بتاؤں جو میں جانتا ہوں''۔ اس نے کہا ''ہاں'' تو ہربذ بولا ''نحیر جان نے مجھے کسریٰ کا خزانہ

دار بنایا تھا۔ اگر آپ مجھے اور میرے بتائے ہوئے لوگوں کو بخش دیں تو میں یہ خزانہ آپ کے سپرد کر دوں گا۔ حذیفہ کے ماننے پر اس نے دو تھیلے پیش کیے جن میں یاقوت اور موتی کے سوا کچھ نہ تھا۔ مسلمانوں نے اس بات پر اتفاق کیا کہ یہ خزانہ حضرت عمرؓ کی خدمت میں بھیج دیا جائے اور کسی اور کو حصہ نہ دیا جائے۔ سائب نے انھیں خلیفہ کے سامنے پیش کیا تو انھوں نے اسے کوئی فیصلہ کرنے تک بیت المال میں جمع کر دینے کا حکم دیا اور اسے فوج میں واپس چلے جانے کے لیے کہا۔ سائب نے حکم کی تعمیل کی۔ حضرت عمرؓ نے تمام رات غور کیا اور اگلے روز انھوں نے سائب کو واپس بلا بھیجا۔ پیامی نے اسے کوفہ کے دروازے پر جالیا۔ دونوں اونٹوں سے اتر کر ملے اور سائب خلیفہ کا پیغام سن کر مدینہ واپس آ گیا۔ جب خلیفہ کی نظر اس پر پڑی تو بولے ''یہ مجھے اور ام السائب کے بیٹے کو کیا ہو گیا یا اُم السائب کے بیٹے اور مجھے کیا ہو گیا۔ دونوں تھیلے لے جاؤ۔ تیرا باپ ہلاک ہو۔ انھیں وہیں لے جاؤ جہاں سے لائے تھے۔ ان جواہر سے حاصل ہونے والی دولت کو مسلمانوں کی بھلائی پر صرف کرو''۔ سائب نے حکم کی بجا آوری میں تھیلے کوفہ کی مسجد میں رکھ دیے جہاں عمرو بن حریث نے انھیں بیس لاکھ درہم میں خریدا اور اس نے انھیں ایران میں چالیس لاکھ درہم میں بیچا۔

۹۲ ہجری میں موسیٰ بن نصیر کا غلام طارق المغرب سے اندلس میں داخل ہوا اور جنگ کے بعد وہاں کے بادشاہ کو قتل کیا۔ بادشاہ جس تخت پر بیٹھا تھا اس کے پایوں پر پہیوں کے ساتھ انواع و اقسام کے جواہر لگے تھے۔ یونانی اسے جنگی گاڑی (بگھی) (مراکب القتال) اور ہندی اسے ''رتھ'' کہتے ہیں۔ شطرنج کے رخ بھی اسی طرح کے ہوتے ہیں۔

بربری وہاں سے ریشمی کپڑے اور جواہر کی بوریاں بھر بھر کر لائے تھے۔ وہ ان کی اصل قیمت سے ناواقف تھے اور انھوں نے یہ اشیاء معمولی قیمت پر فروخت کر دیں۔ جب طارق کے بعد موسیٰ بن نصیر اندلس میں داخل ہو کر طارق سے ملا تو ان کی مشترک افواج طلیطلہ کی طرف بڑھیں اور اسے فتح کر لیا۔ وہاں انھیں حضرت سلیمانؑ بن داؤد کے نام سے منسوب ایک تخت ملا۔ وہ لوگ ہر عجیب چیز کو حضرت سلمان سے منسوب کر دیا کرتے تھے کیونکہ وہ جنّوں کو تسخیر کر چکے تھے جو ان کے لیے غوطہ خوری اور تعمیرات کے کام کرتے تھے۔ یہ تخت سونے اور چاندی سے بنا اور جواہر سے مرصّع تھا اور اس کے تین پہیے تھے۔ اسے خچر کھینچتے تھے۔ اس کا ایک پایہ علیحدہ کر کے وہاں طارق کے حکم پر لوہے کا ایک پایہ لگا دیا گیا کیونکہ اسے موسیٰ سے کچھ سوئے ظن تھا۔ یہ پایہ چھپا دیا گیا۔ محل کے اندر طارق کو چوبیس شاہی تاج بھی ملے۔ جن کی قیمت کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا تھا۔ یہ تاج وہاں کے لوگ اپنے بادشاہوں کی تعداد کا ریکارڈ رکھنے کے لیے جمع کرتے تھے۔ یہ وہاں کی ایک عام رسم بن چکی تھی۔

۹۶ ہجری میں موسیٰ ولید بن عبدالملک کے پاس حاضر ہوا اور وہ تخت خلیفہ کو پیش کیا۔ اس موقع پر طارق نے کہا کہ یہ اس نے حاصل کیا تھا اور موسیٰ سے ڈرتے ہوئے اس کے حوالے کر دیا تھا۔ جب ولید نے اس پر شک کا اظہار کیا تو اس نے کہا کہ موسیٰ سے پوچھا جائے کہ اس کا ایک پایہ کہاں ہے؟ موسیٰ نے کہا کہ اس نے تخت اسی طرح پایا تھا۔ تب طارق نے

وہ پایہ پیش کر دیا۔ ولید قائل ہو گیا اور اس نے طارق کو انعام دیا اور موسیٰ کو جھوٹا قرار دیا۔

خالد بن برمک نے طبرستان کے پہاڑی قلعے کا محاصرہ کیا جہاں الجبل اور مصمغاں کے دو حاکم گھر گئے۔ محاصرے سے گھبرا کر دونوں نے ہتھیار ڈالنے اور اطاعت پر رضامندی ظاہر کی۔ دونوں باہر نکلے تو خالد نے دروازے پر سنتری مقرر کر دیا تا کہ مال غنیمت قلعے سے باہر نہ نکالا جا سکے۔ قلعے کے اندر کسی نے ایک بلّی مار کر اس کے معدے میں جواہر بھر کر اسے سی دیا۔ اس نے اسے قلعے سے باہر پھینک دیا اور کسی کو پتا نہ چلا کہ اس میں کیا تھا۔ اتفاق سے ایک سپاہی اس جگہ کے قریب سے گزرا جہاں مری ہوئی بلّی پڑی تھی۔ وہ اسے خالد کے پاس لایا جس نے یہ معاملہ جان کر پہرے کو اور سخت کر دیا۔ ساسانی بادشاہ نے عراق سے مرو کی طرف فرار ہوتے ہوئے اپنے جواہر اور ہلکی اشیاء بطور امانت یہاں رکھوا دی تھیں۔ اب خالد نے یہ خزانہ پا لیا تھا جس کی قیمت کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا تھا۔

دوار کے علاقے میں زون نام کا ایک طلائی بت تھا۔ اس کی دونوں آنکھوں میں یاقوت جڑے تھے۔ عبدالرحمان بن سمرہ نے اس کی آنکھیں اور ایک ہاتھ کاٹ لیا۔ پھر اس نے پجاری سے کہا ''یہ سونا اور جواہر لے لو۔ میں نے ایسا صرف تمھیں یہ بتانے کے لیے کیا ہے کہ یہ بت تمھیں کوئی فائدہ یا دشمن کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا''۔

کہا جاتا ہے کہ ایک شخص عباسی خلیفہ منصور کے سامنے پیش ہوا اور کہا ''میں فلاں اکاسرہ کے قبرستان میں داخل ہوا اور وہاں اس کے سر پر ایک تاج انمول جواہر اور موتیوں سے مرصّع دیکھا، لیکن میں نے اجازت کے بغیر انھیں لانا پسند نہیں کیا۔ یہ سن کر منصور نے حکم دیا کہ اس شخص کو ستر دُرّے مارے جائیں تا کہ عبرت ہو کہ اس نے ایک زندہ یا مردہ بادشاہ کے مقبرے میں داخل ہونے کی کوشش کی۔ ایسا مروت اور حریت اور سیاست کے عین مطابق ہے لیکن تاریخ دان جانتے ہیں کہ ایرانیوں کے ساتھ فتوحات کے بعد عرب کیا سلوک کرتے تھے اور وہ عباسیوں کی منتقم فطرت سے بھی واقف ہیں۔ عبداللہ بن علی نے تو انتظامی طور پر امویوں کی قبریں تک اکھاڑ دیں تھیں اور منصور کا یہ واقعہ محض ایک افسانے کے طور پر سامنے آتا ہے، اگرچہ اس میں بھی تحسین کا پہلو نکلتا ہے۔

فارس کے قصے ایسی طولانی باتوں سے بھرے ہوئے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے ہاں ماضی کے تہذیب و تمدن اور اپنے بادشاہوں مثلاً کسریٰ (خسرو) کی عظمتیں بیان کرنے کا رجحان پایا جاتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ سراندیپ کے راجا نے نوشیروان کو سات ماہر غوطہ خور، دس ہاتھی اور ٹیک کی لکڑی کی دو لاکھ لاٹھیں ہدیے کے طور پر بھیجیں۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ چین کے شہنشاہ نے ایک گھوڑا مع گھڑسوار (مجسمہ) بطور تحفہ پیش کیا۔ گھوڑے پر موتیوں کی لڑیاں جڑی تھیں اور گھوڑے کی آنکھیں یاقوت کی تھیں۔ اس نے ایک لاجوردی تاج و تخت بھی بھیجا تھا۔ جہاں ایک خوبصورت خادمہ قالین پکڑے ہوئے تھی اور اس کا جسم اس کے بالوں سے ڈھکا تھا۔ قالین ایک طلائی صندوق میں بند تھا۔ ہندوستان کے ایک راجا نے ایک ہزار من عود کی لکڑی بھیجی۔ اسے آگ میں ڈالیں تو پگھل کر سیاہی کا کام کرنے لگے۔ دوسرے تحائف میں

سرخ یاقوت کا پیالہ موتیوں سے جڑا اور دس من کافور جو پستے کی مانند نظر آتا تھا لیکن اس سے بڑا تھا۔ سانپ کی کھال سے بنا ایک غالیچہ جس پر نمونے بنے تھے اور وہ حریر سے ہلکا تھا اور سات ذرع قد کی ایک خادمہ شامل تھے۔ چین کے خاقان نے سوڈھالیں بھیجیں جن پر سونا چڑھا تھا۔ سونے پر چاندی سے آرایش کی گئی تھی نیز دو ہزار من تبتی مشک بھیجا۔

مدائن کا اصل نام طیسفون تھا۔ یہاں خسرو پرویز کا خزانہ ''بہارِ خرم'' موجود تھا۔ میرا خیال ہے کہ اس جگہ کا نام مدائن اس لیے پڑا کہ یہ فارس کے شہنشاہوں کا دارِ مقر (ٹھہرنے کی جگہ) تھا۔ اسی لیے اسے مدینۃ المدائن (شہروں کا شہر) بھی کہا جاتا تھا۔ اس خزانے میں سونے اور چاندی کے سکوں اور برتنوں کے علاوہ گیارہ تھیلے بھی تھے جن میں سے ہر ایک میں تیس ہزار سرخ یاقوت بھرے تھے۔ مزید برآں دس اور تھیلے بھی تھے جو زمرد سے بھرے تھے۔ سو تھیلے اور بھی تھے جن میں ہزار ہزار مشک تھے اور بارہ تھیلے کافور کے تھے۔

یہ سب باتیں ممکنات میں سے ہیں اور ان کی وجوہ پر توجہ کی جاسکتی ہیے۔ ممکن ہے کہ ظروف تو ہوں لیکن ان کی تعداد اور مقدار درست بیان نہ ہوئی ہو۔ راوی کثرت وقلت، بہتر اور بدتر، قیمتی اور نادر میں امتیاز نہ کرسکتا ہو۔ دستِ تنقید کو ہر ایسی بات سے اس لیے روکنا ہوگا کیونکہ سچ اور جھوٹ کے درمیان بہت کچھ اخفا میں ہے۔

ایسے کئی واقعات ہیں جو محض افسانے ہیں اور محض سننے والوں کے لیے گھڑے جاتے ہیں۔ اس تناظر میں ہم خسرو پرویز سے متعلق جوہریوں کے بیانات پیش کرسکتے ہیں کہ اس میں سولہ ایسے خواص تھے جو کسی اور میں نہ تھے۔ اگر ہم انھیں بیان کرنا شروع کردیں تو ان کی طوالت ہمیں اپنے موضوع سے ہٹادے گی۔

ایک قصہ جو کوہستانیوں کے ہاں بہت مشہور ہے کہ ''کوہ راوند'' پتھر جو بیل کی صورت میں تھا اور زمین میں نصب تھا، بدر بن حسنویہ کے دادا حسین کو پیش کیا گیا تھا۔ وہ اس میں شراب ڈال کر حسبِ خواہش پیتا تھا اور اس پر پینے کے نشانات نہ تھے اور نہ وہ کم پڑتی تھی۔ ایک کُرد نے اس سے یہ پتھر مانگ لیا۔ وہ اسے انکار نہ کرسکا کیونکہ اس کُرد نے اس کے دشمن کا سر قلم کیا تھا۔ جب لوگ بڑبڑانے لگے تو اس نے پتھر کا راز جاننے کی خاطر اس کے دو حصے کردیے۔ اس نے دیکھا کہ اس کے اندر سونے سے بنے دو مزدور طلائی انگور نچوڑ رہے ہیں۔ دونوں کی پیشانیاں باہم جڑی ہیں۔ کُرد نے دونوں ٹکڑے پھر سے جوڑنے کی کوشش کی لیکن وہ ایسا نہ کرسکا اور پتھر اپنی لاجواب ندرت کھو بیٹھا۔

ابن زکریا اپنی کتاب الخواص میں لکھتا ہے کہ مصر میں ایک عبادت گاہ ہے۔ تخت پر دو بت بیٹھے ہیں اور روغنِ زیتون کے ایک ناختم ہونے والی قطروں کی دھار تخت سے ٹپک رہی ہے۔ اسے دیکھ کر اس نے اس پر استغفار پڑھی۔

انھی قصوں میں سے ایک جلے ہوئے خزانے کا بھی ذکر ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ایک شاہِ فارس کا خزانہ جواہرات، عطریات اور ایرانی روغنیات سے بھرا ہوا تھا۔ اس پر بجلی گری اور اس کے جلنے کی بدبو سے چالیس فرسنگ تک موجود جانور تک مر گئے۔ کوئی شخص بادشاہ کو اطلاع دینے کی جرأت نہ کرتا تھا۔ انھیں معلوم تھا کہ ایسے واقعات پر وہ ذمہ داروں کو

آسانی سے نہیں بجھتا تھا۔ جب آگ بجھ گئی اور راکھ بن گئی تو خزانے کی راکھ سرخ یاقوت سے بنا ہوا فرش نظر آنے لگی۔ بادشاہ اس پر بہت خوش ہوا کیونکہ ایسے فرش کی قیمت اس کے خزانے کی کل قیمت سے کہیں زیادہ تھی۔ وہ اس یاقوتی فرش کی بنا پر دنیا کے سب بادشاہوں سے آگے بڑھ گیا تھا۔ بادشاہ نے اس فرش سے سولہ ٹکڑیاں کاٹنے کا حکم دیا۔ ہر ٹکڑی ہزار مثقال وزن کی تھی۔ باقی سے شراب پینے کے ظروف بنائے گئے۔

انسان کی حالت پر غور کریں۔ اگر وہ حوادثِ زمانہ پر صبر کرے تو آسمان کی بلندیوں میں بھی جو کچھ ہے وہ اس سے کمتر ہے لیکن جو خیر اور شر میں تمیز نہیں کر سکتے اور فضل و اسراف کو نہیں پہچان سکتے، وہ فائدے کو کیا جان سکتے ہیں۔ کیا وہ اللہ کے فرمان پر غور نہیں کرتے؟

"لن ینال اللّٰہ لحومھا ولا دماؤھا ولکن ینالہ التقوی منکم" (الفرقان ۲۵:۳۷)
(وہ فواحش کے قریب بھی نہیں پھٹکتے اور جب ان کا وہاں سے گزر ہوا تو تقوی اختیار کرتے ہیں)

یہی تدبر ہے کہ وہ اصل لطف اٹھا سکتے ہیں اور نفیس اور خسیس کے درمیان امتیاز کر سکتے ہیں۔ پھر وہ بدی سے دور ہٹ جاتے ہیں اور انھی چیزوں کے پیچھے جاتے ہیں جو اللہ نے ان کے لیے مقرر کر رکھی ہیں۔ اللہ کا فرمان ہے کہ اللہ کے بندے تو وہی ہیں جو:

"واذا مروا باللغو مروا کراما واذا خاطبھم الجاھلون قالوا سلاما" (الفرقان ۲۵:۶۳)
"جب وہ لغو کے قریب سے گزرتے ہیں تو مکرم ہو کر گزرتے ہیں اور جب جاہل انھیں مخاطب ہوتے ہیں تو وہ انھیں کہہ دیتے ہیں: سلام!"

کتب فتوحات سے متعلق ایک قصہ خاصا مضحک ہے کہ جب سعد بن ابی وقاص نے خلیفہ عمرؓ بن خطاب کو لکھا: "مال غنیمت میں میں نے ایک طلائی صندوقچی پائی ہے جس پر طلائی قفل لگا ہے۔ میں کیا کروں؟" تو اسے جواب ملا "بہتر ہے تم اسے فروخت کر دو کہ اس میں عجمیوں کی حماقتیں مقفل ہوں گی"۔ خریدار نے اس کے اندر ایک اور صندوقچی پائی۔ اس کے اندر ایک کاغذ پر یہ نصیحت لکھی تھی۔ "ڈاڑھی کو ٹھوڑی کے نیچے دور تک بڑھانا گالوں کے گرد بڑھانے سے بہتر ہے"۔ خریدار نے معاہدہ ختم کرنا چاہا۔ سعدؓ بن ابی وقاص نے خلیفہ کو ان کے فیصلے کے لیے لکھا۔ اسے جواب ملا۔ "اس سے پوچھو کہ اگر اس میں اس کی توقع سے زیادہ بڑا خزانہ ملتا تو کیا وہ پھر بھی ایسا ہی کرتا؟"۔ خریدار نے کہا "پھر میں یہ معاہدہ ختم کیوں کرتا؟"۔ اس پر سعد بولا "اسی لیے تو ہم بھی یہ معاہدہ ختم کرنے کے لیے تیار نہیں"۔ اسی بابت تو اسماعیل بن علی نے کہا ہے ؎

کا لسفط المقفل قد زخرفت
حاشیاہ بفنون النقط
بقول من غربہ مشرحا
کم جوھر ضمن ھذا السفط
حتی اذا اسلمہ قفلہ

لم یک الا الریح فیه فقط

(''صندوقچی کے اردگرد کئی نمونے آرایش کیے گئے تھے۔ جو اس کی محبت میں گرفتار ہوا اس نے سمجھا کہ صندوقچی میں انواع واقسام کے جواہر ہوں گے۔ لیکن قفل کھلنے کے بعد صرف ہوا کا تحفہ ملا'')۔

یاقوت وجواہر کی رنگارنگی:

جوہریوں کے نزدیک سرخ یاقوت کے بعد ''موردالاصفر'' (پیلاہٹ مائل) کا درجہ ہے۔ جس کے بعد ''غباری'' خاکی (میلا سا)۔ کسی ایک پتھر میں کئی رنگ ہونا ممکن ہے کیونکہ انھیں ایسا کثیر رنگی پتھر ملا ہے جس میں سرخ، زرد، سبز اور سفید حصے موجود تھے۔ وہ جانتے ہیں کہ آگ سے سوائے گلابی کے تمام رنگ جل جائیں گے۔ سرخ رنگ اصل ہے۔ باقی رنگ حادثاتی ہیں جو گرم کرنے پر اڑ جاتے ہیں اور جوہر بلور کی مانند شفاف ہو جاتا ہے۔ الکندی کا یہ بیان کہ اس نے ہندوستان سے کچھ جواہر خریدے اور انھیں گرم کیا حتیٰ کہ ان کے رنگ اڑ گئے، اس بات کو ثابت کرتا ہے۔

زرد قسم:

زرد قسم میں جوہریوں کے مطابق وہی بہتر ہوتی ہے جو چمکتی سرخی مائل ہو۔ تقریباً سرخ انار کے دانوں کی مانند۔ اس کے بعد ''مشمشی'' (کانسی) رنگ ہے، پھر ''اترنجی'' (نارنجی)، پھر ''تبنی'' (تنکے کی مانند)۔ یہ رنگ آہستہ آہستہ کم پڑنا شروع ہو جاتے ہیں حتیٰ کہ سفید رہ جاتے ہیں۔ بہترین نوع وہی ہے جس کا وزن ایک مثقال ہو۔ اس کی قیمت سو دینار ہوتی ہے۔ یہ قیمت (رنگ کے لحاظ سے) کم ہوتے ہوتے ایک دینار فی مثقال رہ جاتی ہے۔ الکندی لکھتا ہے:

7 کرکہن (گارنٹ) کی تمام انواع سرخ یاقوت کی مانند ہوتی ہیں۔ ان میں سے بعض اقسام خلوقی (خوشبودار)، زیتی (زیتونی سبز) اور فستقی (کائی رنگ) ہیں۔ بوقلمون (کثیر لونی) ایسی قسم کو کہتے ہیں جس میں یہ تمام رنگ چمکتے ہیں۔ پتھر کو مختلف سمتوں میں گھمانے سے مختلف رنگ جھلکتے ہیں۔ وہ بوبر اقیش پرندے کی مانند ہوتے ہیں جس کے پر روشنی اور سایے میں مختلف رنگت جھلکاتے ہیں۔

وہ مزید لکھتا ہے: ''زرد کرکہن دیکھنے والے کو فریب دیتا ہے، کیونکہ یہ زرد یاقوت کی مانند ہوتا ہے۔ دونوں کو روشنی اور رگڑ سے جانچا جاسکتا ہے۔ اس میں نمی زیادہ ہوتی ہے''۔

الکندی کے بیان کے مطابق روشنی نگینے سے منعکس ہوتی صرف اس وقت دیکھی جاسکتی ہے جب اسے گھمایا یا ہلایا جائے۔ پتا چلتا ہے کہ یہ اس کے فطری رنگ نہیں بلکہ فریب نظر ہے۔ بوقلمون (کثیر لون) اور بوبر اقیش (دھنک رنگ) بلور کے ٹکڑوں میں دیکھے جاسکتے ہیں۔ مختلف خوبصورت رنگ بلور کی سطح پر ظاہر ہوتے ہیں۔ یہ رنگ نظریں قریب لانے پر بھی نظر آتے ہیں، خواہ بھنویں سورج اور آنکھوں کے درمیان سایہ بھی کر دیں۔ نصر کہتا ہے:

بہترین قسم چمکیلی زرد ہے، جو آب وتاب کے ساتھ ہو۔ اس کے بعد ''خلوقی'' ہے جو چمکیلی رنگت میں ہے۔ اس کے بعد ''گلناری'' ہے جو خلوقی سے زیادہ تابدار اور رنگدار ہے۔ ان اقسام میں ''گلناری'' بہترین ہے۔

غباری (خاکی) قسم:

اس قسم کے پتھروں میں بہترین قسم ''طاؤسی'' ہے جس کے بعد آسمانی اور آبگوں قسمیں ہیں۔ آبی رنگ کی بہترین قسم سفید کے نزدیک تر ہے۔ دوسری قسمیں ''کحلی'' (سرمئی) اور ''نفطی'' (سیاہ) ہیں، اگرچہ یہ تاریک ہیں۔ ''طاؤسی'' کے ایک مثقال کی قیمت دس دینار ہے۔ رنگ کے ساتھ قیمت کم ہوتی رہتی ہے حتیٰ کہ ایک دینار فی مثقال تک آ جاتی ہے۔ نصر لکھتا ہے:

> غباری یا خاکی قسم کے اپنے درجے ہیں۔ غباری پتھر اپنے رنگ کی گہرائی سے پہچانے جاتے ہیں۔ بہترین رنگ آسمانی، نیلی، پھر نیلی، پھر گہری بھوری (کحلی) اقسام کے ہیں۔ بہترین قسم گہرے رنگ کی ہوتی ہے۔

الکندی لکھتا ہے:

> ''آسمانی زرد قسم جب ہلکی زرد پڑنے لگتی ہے تو اسے حرارت دی جاتی ہے حتیٰ کہ اس کا ہلکا زرد پن ختم ہو جاتا ہے۔ مزید گرم کرنے پر اصل خاکی رنگ بھی غائب ہو جاتا ہے''۔

اس بیان میں الکندی کا استدلال یہ ہے کہ زرد رنگ خاکی کی نسبت کم ٹھہرنے والا ہے۔ میں نے ایک نگینہ دیکھا ہے جس کا وزن چالیس مثقال ہے۔ اس سے بڑا ابھی نہیں دیکھا۔ اسی وزن کا ایک سفید نگینہ بھی ہم نے دیکھا ہے۔ ہمارے خوارزمی خزانے میں بھی ایک نگینہ ساٹھ سے زیادہ مثقال وزن کا موجود ہے۔ اس پر ایک لڑکی کی تصویر تھی، جس نے اپنی دونوں ٹانگیں اپنی چھاتی پر رکھی ہوئی تھیں اور اپنی ٹھوڑی ان پر ٹکائی ہوئی تھی اور انگلیاں پنجوں میں۔ الکندی نے جواہر سے بھرا ایک تھیلا خریدا۔ اس کے بارے میں وہ کہتا ہے: ''بظاہر اس میں ہر رنگ کے پتھر موجود تھے لیکن روشنی میں مشاہدے سے پتا چلا کہ اس میں سرخ، زردی مائل اور نیلے یاقوت ہیں''۔

کرکند (گارنٹ) اور کرکہن زرد، پستئی رنگ، زیتونی اور خلوقی ہوتے ہیں۔ جزبز (Tourmaline) کی بعض اقسام بہت سرخ اور کچھ کم سرخ ہوتی ہیں لیکن جواہرات کا اصل رنگ حرارت دینے اور رگڑنے سے ظاہر ہوتا ہے۔ میرے ایک دوست نے مجھے ہندوستان کی ایک کتاب سے پڑھ کر سنایا کہ خاکی رنگ کی سب سے ہلکی قسم وہی ہوتی ہے جو گہرے سرخ رنگ میں اور گول ہو۔ یہ دھوپ میں گہری نظر آتی ہے۔

ملاحوں نے یاقوت سے متعلق ایک واقعہ سنایا ہے۔ ایک دفعہ تفریحی سفر کے دوران میں وہ ایک پہاڑ سے گزرے جو ایک خلیج پر نوکیلی شکل میں چھایا ہوا تھا۔ سمندر چٹانوں سے ٹکرا رہا تھا اور ملاح اس کے نچلے حصے کی طرف چلے گئے۔ وہ گہرے سمندر میں دھکیلے جانے کے خوف سے ساحل کے ساتھ ساتھ جا رہے تھے۔ انھوں نے چٹانوں سے لٹکے ہوئے یاقوت کے ٹکڑوں پر تیر برسائے تاکہ انھیں گرا سکیں۔ وہ ٹکڑے جو اتھلے پانی اور ساحل پر گرے، انھیں جمع کر لیا گیا اور انھیں جوہریوں کے پاس بیچا گیا۔ الکندی کہتا ہے:

> افلح (اوپل) کی آسمانی نیلے رنگ کی ایک قسم ہے، جو بالکل فیروزے کی مانند نظر آتی ہے[۲۷]۔ لوگ آسمانی سے دھوکا کھا کر اسے افلح یاقوت کے طور پر خرید لیتے ہیں۔ اس پتھر کی ایک گہرے رنگ کی قسم بھی موجود ہے۔ وہ بہت

نچلے درجے کی ہوتی ہے۔

وہ مزید کہتا ہے: ''تمام اقسام یاقوت کی کانوں ہی سے برآمد ہوتی ہیں سوائے افلح کے۔ یہ سراندیپ کے شہر مندرون سے لائی جاتی ہے''۔

مندرون سے مندری پتن کی بندرگاہ مراد ہے۔ اگر آپ یاقوت کی مختلف اقسام اور رنگ ملاحظہ کریں تو آپ انھیں مختلف درجوں میں پائیں گے۔ یہ ٹکڑے جتنے چھوٹے ہوں گے اتنے ہی قیمتی ہوں گے۔ وہ دھاتوں کی طرح کثیر نظر آئیں گے۔ ہم نے سونے، چاندی اور تانبے کا ذکر کیا ہے جو انھی مقامات سے نکلتے ہیں۔ ان کی قیمت ان کے استعمال پر منحصر ہوتی ہے۔

ہم نے یاقوت کے مختلف اوزان کا ذکر کیا ہے، خواہ ان کا حجم ایک سا ہو لیکن رنگ مختلف ہوں گے۔ یہ بیانات میرے ذاتی تجربات اور مشاہدات پر مبنی ہیں۔ میں نے خاکی ''غباری'' یاقوت کو ''سرخ'' کی نسبت (کثافت اضافی میں) زیادہ وزنی پایا جس سے بظاہر سرخ یاقوت کمتر درجے کا محسوس ہوتا ہے۔ لیکن اس کی وجہ شاید یہ ہے کہ سرخ یاقوت میں مسام نہیں ہوتے اور چھوٹے حجم کی بنا پر پانی اس میں داخل نہیں ہوسکتا۔ چنانچہ اس میں پانی کی بجائے پھیپھڑوں کی طرح ہوا ہوتی ہے۔ ''غباری'' (خاکی) کے چھوٹے مسام ہوا کو داخل ہونے اور پانی کو نکلنے نہیں دیتے۔ اگر سوراخ اتنے بڑے ہوں کہ ان میں ہوا یا پانی داخل ہوسکے تو یقیناً پانی خارج ہوجائے گا۔

ہمارا تجربہ پانی پر مبنی تھا۔ میں نے اس موضوع پر ایک رسالہ لکھا ہے جو اس کی مزید وضاحت کرتا ہے۔ اس تجربے نے ثابت کیا ہے کہ ''غباری'' خاکی قسم اگر سوا کائی کا وزن رکھتی ہو تو اسی حجم میں سرخ یاقوت ۹۷ یا ۹۸ ہوتا ہے۔ اعشاریہ کو نظر انداز کرنے کے لیے اگر ہم کہیں کہ اگر سرخ کا وزن ۷۰ ہو تو ''غباری'' کا وزن ۸۸۰ ہوگا۔ ہم نے دوسرے رنگوں پر تجربات نہیں کیے۔ مجھے یقین ہے کہ سفید، سبز اور سرخ اقسام بھی ''غباری'' قسم کی طرح ہوں گی کیونکہ وہ بھی اس کی طرح ٹھوس، بھاری، بے مسام اور ''احمر'' قسم کی طرح مساموں سے پاک۔ ہم نے ''غباری'' (خاکی) قسم کے وزن کو سو کے معیار کا پیمانہ بنالیا ہے، جس پر ہم تمام جواہر کی (کثافت اضافی) پیمایش کریں گے۔ ہم ہمیشہ اسی کو مطلق وزن کے طور پر لیں گے۔ الکندی کہتا ہے: ''تمام جواہر میں یاقوت (کثافتِ اضافی میں) سب سے زیادہ وزنی ہے۔ اگر ہم یاقوت کا کوئی ٹکڑا لیں اور کسی اور ہم حجم جوہر کے ساتھ اس کا موازنہ کریں تو یاقوت کو سب سے زیادہ وزنی پائیں گے''۔

ہر چیز اپنے حجم کے مطابق جگہ گھیرتی ہے اور یہ گھیراؤ ظاہر ہے طبعی نہیں۔ یہ اس کے سائز اور پیمایش پر ہے اور نہ اس بنا پر وہ رنگ پکڑتے ہیں۔ اگرچہ جواہر پگھلائے نہ جاسکیں تو بھی لوگ ان کی حفاظت کرتے ہیں۔ سیسہ، پارہ اور سونا ان پتھروں سے (کثافتِ اضافی میں) وزنی ہیں اور وہ آگ سے پگھل جاتے ہیں۔

سبز قسم:

جوہریوں کے مطابق یاقوت کی سبز اقسام میں بہترین قسم زیتی ہے، پھر فستقی۔ یہ رنگ رفتہ رفتہ مدھم ہوکر سفید ہو

جاتے ہیں۔سبز کی قیمت خاکی (غباری) قسم سے برتر نہیں ہوتی۔ابوالعباس عمانی نے کہا ہے کہ خاکی (غباری) اوقلہ یا اقلھا ہے۔یہ انتہائی بے رنگ، کمتر اور نرم قسم ہے۔میرا خیال ہے کہ الکندی نے جسے افلح کہا ہے، اسے کتابت کی غلطی سے نصر نے افلج لکھا ہے جو اوقلہ یا اوفلہ (اوپل) ہے۔

رازی برادران کہتے ہیں کہ امیر یمین الدولہ نے شہر ناہورہ کے بت خانے سے جو پتھر حاصل کیا اوقلہ تھا۔اس کا وزن پینتیس مثقال سے زیادہ تھا۔اسے ہندوستان کی کان سے نکالا گیا تھا۔یاقوت سے موازنہ کرتے ہوئے اوقلہ وہی حیثیت اختیار کرتا ہے جو بلور اور جمست (ایمی تھسٹ، کٹیلا) کی یاقوت کی نسبت سے ہے[۲۸]۔یہ نگینہ پچانوے مثقال سونے میں جڑا گیا۔بادشاہ نے اتنا سونا اس لیے لگوایا کیونکہ وہ اپنے معاصر بادشاہوں سے فتوحات میں سونے اور جواہر کے حوالے سے زیادہ افتخار ظاہر کر سکے۔**کتاب الفتح** میں ایک خاکی یاقوت کا ذکر ملتا ہے۔میں نے یہ نگینہ اس وقت دیکھا جب سلطان واپس آ رہا تھا۔اس سے ذرا سا سبز رنگ آئینے کی طرح جھلک رہا تھا۔اسے ہاتھ کی دونوں مٹھیوں کے درمیان رکھا جا سکتا تھا۔یہ ایک طرف سے سفتہ تھا، جس سے سونے کا تار نکلا ہوا تھا اور قریب ہی نام اور کچھ عبارت کندہ تھی۔میں نے اسے ہاتھوں میں پکڑا تو یہ ذرا ہلکا محسوس ہوا۔سلطان کے ایک ملازم نے اسے مجھ سے لے لیا مبادا میں اس میں کوئی خلافِ معمول چیز نہ ڈھونڈ لوں۔

سفید اور سیاہ:

جوہریوں کے نزدیک ''نفطی'' اور ''کحلی'' اقسام سیاہ ہوتی ہیں اور دونوں ''غباری'' خاکی ہی ہیں جن میں تہ در تہ رنگ خراب ہو گئے ہیں۔ایک قسم سفید ہوتی ہے جو پوری طرح سے سفید ہی ہوتی ہے۔ایک اور ایسی ہے جس میں کوئی رنگ ظاہر تو ہوتا ہے لیکن رگڑنے پر سفید ہی نظر آتی ہے۔بعض اوقات جوہری اس کے مساموں سے کوئی رنگ داخل کر دیتے ہیں۔مونھ میں ڈالنے پر یہ وزنی اور سرد محسوس ہوتا ہے۔نصر لکھتا ہے:

> سفید قسم دو طرح کی ہوتی ہے: ایک بلور کی مانند اور دوسری جو بلور کی خاصیت نہیں رکھتی ذرا سخت ہوتی ہے، اس لیے اسے مذکر جنس میں بیان کیا جاتا ہے۔

ہندوستان کے لوگ ایک پتھر کا ذکر کرتے ہیں، جسے ''حجر القمر'' (Moonstone) کہا جاتا ہے۔وہ اسے ''چندر کانت'' کہتے ہیں۔اس لفظ کے معنی ہیں ''چاند کی شعاع''۔اس پتھر کا ذکر یحیٰی نحوی نے ''بروقلس'' کے دفاع میں نہیں کیا۔وہ کہتا ہے کہ سفیدی اس کی سطح سے جھلکتی ہے اور یہ چاند کے بڑے ہونے کے ساتھ ساتھ بڑی سفید جھلک دیتا رہتا ہے۔جب چاند اترنے لگتا ہے تو یہ بھی چھوٹی جھلک دینے لگتا ہے اور جب پھر چاند نکل آتا ہے تو اس کی جھلک بھی بڑی ہوتی جاتی ہے۔ہندوستان کے لوگوں کا خیال ہے کہ اگر اسے سمرہ پھل کے اندر رکھ دیا جائے تو اس میں سے پانی ٹپکنے لگتا ہے۔میرا خیال ہے کہ یہ پتھر بلور ہے۔**اخبار السندھ** میں بیان ہوا ہے کہ اس ملک کے بادشاہ نے سکندر کو اس سے بنا ایک پیالہ اور دیگر تحائف دیے تھے۔ان کا خیال تھا کہ یہ پیالہ خود بخود پانی سے بھر جاتا ہے۔میرا بھی خیال ہے کہ یہ وہی خود بخود قسم کا بلور ہو

گا۔ایسا ہونا ممکن ہے۔اس سلسلے میں کوئی توجیہ کی جاسکتی ہے۔لیکن یقین سے یہی کہا جاسکتا ہے کہ یہ ''حجر القمر'' ہی ہے [۲۹]۔

سفید یاقوت بلور سے زیادہ وزنی ہوتا ہے۔اس کی خاصیتوں میں سے ایک یہ ہے کہ یہ مون ☽ ھ میں سرد محسوس ہوتا ہے۔اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ پانی اس کی سطح پر جمع ہوتا ہے بالکل اسی طرح جیسے دھات کے برتن کے باہر، جس کے اندر گرمیوں میں برف رکھی گئی ہو، پانی کے قطرے جمع ہو جاتے ہیں، بشرطیکہ اسے تاریک جگہ پر رکھا گیا ہو۔ایسے موقع پر لوگ سمجھتے ہیں کہ پانی دھات کے اندر سے نکل آیا ہے۔ہندوستان کا نمدار موسم اس فعل کے لیے بے حد معاون ہوتا ہے لیکن پانی اس طرح اس سے نہیں نکلتا۔اگر ان قطروں کو جمع کرلیں تو پانی کی تھوڑی سے مقدار ضرور حاصل ہو جاتی ہے لیکن برتن کا وزن قائم رہتا ہے۔یہ کم نہیں ہوتا، بشرطیکہ اسے پورے طور پر بند کیا گیا ہو۔

سیسرد اپنی کتاب مجمل و مفصل میں اس پتھر کا ذکر کرتا ہے۔اس نے اس کے پانی کو ایک معالجے میں استعمال کیا تھا اور بیان کیا ہے کہ اس کا پانی بخار کم کرنے اور بدروح کو بھگانے میں مفید ہے۔لوگوں کا عام خیال یہ ہے کہ یاقوت غباری (خاکی) سے سفید، زرد، اور بال آخر سرخ رنگ کی طرف ارتقا رکھتا ہے۔شاعر غضائری کہتا ہے:

از بسی کشتن بحال از حال شد یاقوت پاک
پیشتر اصفر بباشد تاکہی احمر شود

(یہ اکثر ہوتا ہے کہ خالص یاقوت کی حالت بال آخر سرخ رنگ کی طرف رجوع کرتی ہے خواہ پہلے وہ زرد ہو)۔

جب دوسری حالت میں بدلتا ہے تو یاقوت زیادہ صاف ہو جاتا ہے۔عام طور پر یہ زرد ہوتا ہے اور بال آخر سرخ ہو جاتا ہے۔کیوں کہ لوگوں نے طبیعیات دانوں سے یہی سنا ہے کہ یاقوت اپنی حالت تکمیل کو پہنچ کر سرخ ہو جاتا ہے، جس طرح سونا خالص پن میں سرخی مائل ہوتا ہے۔ان کا خیال ہے کہ یاقوت آہستہ آہستہ ترقی کر کے سرخ ہو جاتا ہے اور پھر اس پر قائم رہتا ہے اور یہ حالتِ تکمیل ہے اس کے بعد کوئی درجہ نہیں۔اسی طرح سونا اپنے منبع پارے اور گندھک سے ترقی کر کے مختلف مائعات اور قلعی، پیتل، سیسہ، چاندی اور ایک خاص کثافت نوعی حاصل کر کے ایک کے بعد ایک حالت میں تکمیل کی صورت پالیتا ہے جس کے بعد کوئی حالت نہیں۔ان کا یہ بھی خیال ہے کہ اس کا وزن زمین کے اندر بڑھتا رہتا ہے جبکہ یہ کوئی دوسری صورت نہیں بدلتا۔سونے کے مقابلے میں آدمی اپنی حالتِ تکمیل پر ہے اور یہ تکمیل اس نے اپنے مزاج اور فطرت کے باعث حاصل کی ہے۔اس لیے نہیں کہ اس نے مختلف جانوروں سے ارتقا حاصل کیا ہے۔اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ کبھی کتے، ریچھ اور بندر سے ترقی پا کر انسان نہیں بنا [۳۰]۔ابوبکر علی بن حسین قہستانی کہتا ہے:

كذا اليواقيت فيما قد سمعت به
من طول تأثير جرم الشمس فى الحجر

(جیسا کہ میں نے سنا ہے پتھر پر طویل عرصہ تک سورج کے چمکنے سے یاقوت بنتا ہے)

اگر شاعر کا یہ خیال ہے کہ تمام پتھر طویل عرصہ تک دھوپ میں رہنے سے یاقوت بن جاتے ہیں تو اسے اپنی ذاتی

رائے رکھنے کا حق حاصل ہے لیکن حقیقت میں ایسا نہیں ہوتا۔ اگر اس کا خیال یہ ہے کہ وہ پتھر جس میں یاقوت بننے کی صلاحیت موجود ہے وہ یاقوت بن جاتا ہے تو وہ صحیح کہہ رہا ہے۔ ہم اس کا ذکر کر چکے ہیں۔ منصور مورد کہتا ہے:

کجا خاک درگاہش از کیمیا است
کیاقوت کردد ہمی رو مدر
(اس جگہ کی خاک بھی کیمیا ہے کہ مٹی کو یاقوت بنادے)

امتدادِ زمانہ کے ساتھ کوئی بھی چیز کسی اور شے میں بدلتی رہتی ہے لیکن شاعر کی یہ بات کہ مٹی یاقوت میں بدل گئی اظہار کی انتہا ہے۔ شاعر مدح و ذم میں ایسی انتہائی رائے ظاہر کرتے رہتے ہیں۔

حواشی و تعلیقات:

۱۔ یاکند اور یاقوت Hyacinth کے مفرّس اور معرّب نام ہیں جو ہر شفاف سُرخ پتھر کے لیے استعمال ہوتے رہے ہیں۔ پہلی بار البیرونی نے Ruby کے لیے یاقوت کی تحدید کی ہے۔

۲۔ یہاں البیرونی کی مراد سنگ مادر (Mother Rock) کرنڈ (Corundum) سے ہے، جو بنیادی طور پر بے رنگ ہوتا ہے۔ اس کے نزدیک مختلف آلایشیں اس کا رنگ بدلتی ہیں۔ سرخی مائل رنگت یاقوت کہلاتی ہے۔

۳۔ عربی متن میں اسے ''سبج'' اور ''سیج'' دونوں طرح سے لکھا اور سمجھا گیا ہے۔ انگریزی مترجم نے ''سبج'' کو ترجیح دی ہے۔ جبکہ البیرونی کے عام مطالعے میں فارسی ''ہ'' کا تلفظ عموماً ''ج'' سے ظاہر کیا گیا ہے۔ جیسے وہ ''فیروزہ'' کو ''فیروزج'' لکھتا ہے۔ قیاس غالب ہے کہ یہ لفظ ''سیہ'' (Black) ہے۔ طاعون کا رنگ بھی سیاہ قرار دیا جاتا ہے۔ ''سیہ اسمور'' کا مطلب ''دافعِ سیاہ'' ظاہر کیا گیا ہے۔ مجازی طور پر ''دافع طاعون'' کہا گیا ہے۔ اس لیے یہاں یہ لفظ ''سیہ'' ہی ہے۔

۴۔ انگریزی مترجم نے یہاں نیلوفر کی بجائے ''سفید یاقوت'' ترجمہ کیا ہے، جو غلط ہے۔ اصل عربی متن میں ''یاقوت'' کا لفظ موجود نہیں۔ اس لیے یہاں البیرونی کی مراد تالابوں کے ''سفید کنول'' ہی سے ہے۔

۵۔ انگریزی مترجم نے ''رمانی'' کی بجائے ''عمانی'' لکھا ہے۔ ''رمانی'' (انار کی مانند) درست ہے اور یہی عربی متن کا مطبوعہ لفظ بھی ہے۔

۶۔ کائنات کی ہر قدرتی حرکت دائیں سے بائیں ہے۔ دل کے دائیں جوف میں گندہ خون داخل ہو کر دل میں جاتا ہے اور دائیں طرف ہی سے پھیپھڑوں میں داخل ہوتا ہے۔ پھر بائیں جوف سے صاف خون واپس جسم میں جاتا ہے۔ کعبہ ان کے بائیں کندھے کی طرف ہوتا ہے۔ زمین بھی (کعبہ سمیت) قطب شمالی کے گرد دائیں سے بائیں کو گردش کرتی ہے۔ چاند بھی زمین کے گرد دائیں سے بائیں طرف اور زمین بھی سورج کے گرد دائیں سے بائیں طرف گردش کرتی ہے۔ برقیے بھی ایٹم کے مرکزے کے گرد دائیں سے بائیں۔ برقی پنکھے بھی دائیں سے بائیں طرف گردش کرتے ہیں۔ مولانا روم کے مرید بھی اپنے گرد دائیں سے بائیں گردش کرتے ہوئے مرشد کے گرد بھی دائیں سے بائیں دائرے میں گھومتے ہیں۔ اس لیے دل کے دائیں جوف میں خون سرخ قرمزی رنگ ہی کا ہوگا۔

۷۔ یہاں بھی ''بہرامج'' دراصل ''بہرامہ'' ہے (وہی ''ج'' اور ''ہ'' کا تبادل)۔

۸۔ بعض کے نزدیک ''حُرف'' دوسری قسم کا پودا ہوتا ہے۔

۹۔ یہ ۱۲۲۴۰ گرین کے مساوی ہے۔

۱۰۔ ایک دانیق = ۵۵ء۰ گرام یعنی دو قیراط سے زیادہ۔

۱۱۔ یعنی = ۵۶۲۵ء۱ گرام۔

۱۲۔ گویا البیرونی تمام سرخ پتھروں کو یاقوت نہیں سمجھتا۔ اس کے نزدیک لعل (Spinel) اور یاقوت (Ruby) الگ الگ پتھر ہیں۔

۱۳۔ دراصل جواہر کی دمک کو پانی کی دمک ہی سمجھا جاتا ہے اور اسے جواہر کی آب کہتے ہیں۔ اسی لیے عام طور پر یہی سمجھا گیا ہے کہ جواہر میں پانی ہوتا ہے۔

۱۴۔ یہاں البیرونی سائنسدان کا رویہ اختیار کرتا ہے اور یاقوت کی رنگت کا سبب کسی اور عنصر کو قرار دیتا ہے جو اس میں شامل ہو جاتا ہے اور اسے محض تخیل اور قیاس آرائی پر نہیں چھوڑنا چاہتا۔

۱۵۔ سری لنکا کے اس مقام پر ''آدم کی چوٹی'' تک سیڑھیاں بنا دی گئی ہیں تا کہ زائرین آسانی سے چڑھ سکیں۔

۱۶۔ البیرونی امکانات کو تسلیم کر کے اپنے سائنسی انداز کو برقرار رکھتا ہے۔

۱۷۔ جدید دور میں موہ (Moh) کے پیمانے میں بھی ہیرا دس نمبر کی خراشیدگی رکھتا ہے اور یاقوت اور نیلم نویں نمبر پر ہیں۔ گویا ہیرا یاقوت سے برتر ہے۔

۱۸۔ انگریزی مترجم نے ''سرخ'' کی بجائے ''سیاہ یاقوت'' ترجمہ کیا ہے۔

۱۹۔ یہاں بھی البیرونی سرخ کرکند کو یاقوت نہیں سمجھتا۔ ہمارے نزدیک البیرونی دراصل تامڑا کی بات کرتا ہے۔ اس کی زرد قسم بھی ہوتی ہے۔

۲۰۔ گربز یا جزبز دراصل ترمری (Tourmaline) ہے۔ کیونکہ تامڑا سختی یا خراشیدگی میں ترمری سے برتر ہے۔ ایک امکان کنزائٹ کا بھی ہے، جو کئی رنگوں میں بیک وقت موجود ہوتا ہے۔

۲۱۔ جزبز ہونا سے مراد ''لال پیلا'' ہونا ہے۔ ترمری کا پتھر اسی طرح مختلف رنگوں کا ہوتا ہے۔ البتہ کنزائٹ کا ایک ہی پتھر مختلف رنگوں سبز، گلابی، پیلے میں ملتا ہے۔ آگے چل کر البیرونی نے جو وضاحت کی ہے وہ اس بات کو ثابت کرتی ہے کہ یہ ترمری ہی ہے۔

۲۲۔ اوپل یا اوپلا کو عربی میں افلہ، ابلہ اور ابلج کہا گیا ہے۔ یہاں وہی ''ج'' اور ''ہ'' کا تبادل واقع ہو رہا ہے۔ عقیق اوپل سے سختی اور خراشیدگی میں برتر ہوتا ہے۔ یہی بات البیرونی نے کہی ہے۔

۲۳۔ یہاں البیرونی نے بھی محض اٹکل سے کام لیا ہے۔

۲۴۔ یہاں انگریزی مترجم کچھ سطریں چھوڑ گیا ہے۔

۲۵۔ ''جبل'' انگوٹھی المقتدر باللہ کے عہد تک عباسی خزانے میں تھی۔ پھر یہ بویہ خاندان کے ہاتھ منتقل ہو گئی۔ اس کے بعد یہ طغرل بک سلجوق کے پاس پہنچی۔ ۴۵۱ھ میں اس نے القاسم کی بیٹی کو جہیز میں دے دی۔ اس سے پہلے یہ ابونصر احمد بن مروان کُرد کے پاس تھی جو ملک منصور بن ابی طاہر بویہ کی نسل سے تھا۔

۲۶۔ البیرونی مخفی روشنی کی بات کرتا ہے جو عدسے کے ذریعے واضح ہو جاتی ہے۔

۲۷۔ یہاں افلح سے مراد اوپل ہی ہے۔

۲۸۔ انگریزی مترجم جمست کو کٹیلا یا Amethyst نہیں سمجھتا۔

۲۹۔ البیرونی درست طور پر اسے Moonstone ہی سمجھتا ہے۔

۳۰۔ البیرونی نظریۂ ارتقا کو تسلیم نہیں کرتا۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ نظریۂ ارتقاء ڈارون سے بہت پہلے موجود تھا۔ مثلاً الجاحظ، مولانا روم وغیرہ کے ہاں۔

کتابیات:

1. Ahmad, M. R Behari and B.V. Subbarayappa, *Biruni:An Introduction to his Life and Writings on the Indian Sciences*, Indian J. History Sci. 10(2) (1975), 98-110.
2. Alberuni, Muhammad bin Ahmed (ed. by) Fritz krenkow,(1355 H./ 1936 A.D.), *Kitab ul Jamahir Fi Marfatil Jawahir*, Osmania, Oriental Publications, Hyderabad, Deccan.
3. **Ibid,** Said,H.M.,(Eng.tr.),(1410H./1989 A.D.), *Hundred Great Books*, Hijra Council, Islamabad.
4. Baratov, R.B., *Biruni-Great Scientist of the Orient*, (Russian), Lzv.Akad. Nauk Tadzik. SSR Otdel. Fiz.-Mat. i Geolog.-Him. Nauk (3) (49) (1973), 3-5.
5. Boilot, D.J, L'Oeuvre, (1956), *d'Al-Birumi:EssaiBibliographique*, in MIDEO, ii, 161-256 and iii, 391-396,
6. Convington, Richard (May-June 2007), "Rediscovering Arabic Science", Saudi Aramco World, pp. 2-16.
7. Glick, Thomas, F.; Livesey, Steven John; Wallis, Faith (2005), *Medieval Science, Technology and Medicine: An Encyclopedia,* Routledge, ISBN 0415969301
8. Kennedy, E.S. (1970-80). "Biruni, Abu Rayhan al-". *Dictionary of Scientific Biography*, New York: Charles Scribner's Sons.
9. Rashed, Roshdi; Morelon, Regis (1996), *EncyclopediaoftheHistoryofArabicScience,* 1 & 3, Routledge.
10. Rozenfeld, B.A.+M.M., Rozhanskaya and ZK Skolovskaya,(1973), *Abu'l-Rayhan al-Birumi*, (973-1048) Russian, Moscow.
11. Said (ed.), H.M., (1979), *Biruni Commemorative Volume: Proceedings of the International Congress held in Karachi, November 26-December 12, 1973*, Karachi.

آن لائن ماخذ:

۱۔ "On Stones": Biruni's works on geology, medical properties of gemstones (http://www.f arlang. com/gemstones/biruni- book- gemstones/page_001) full text version+comments

۲۔ Alberuni, (www.fantasticasia.net---Alburuni)

۳۔ www.al-qalam.org/index.php

۴۔ www.muslimheritage.com

۵۔ Encyclopedia Iranica, *BIRUNI ABU MUHAMMAD B. AHMED*" .(www.Iranica.com)

Abstract

The Book on Precious Stones, by Muhammad-bin-Ahmed Alberuni is a most valuable book on gemmology and physical chemistry. Its literary style is also noteworthy. The Arabic text was edited by Fritz Kren Kow and published in 1355 H/1936 A.D. form Hyderabad Deccan. The Arabic Text was translated in English by Hakeem M. Saeed (Said) and published by Hijra Council, Islamabad in 1410H/1989. It is now being translated in Urdu with annotation. The Urdu translation of the 1st chapter of its 2nd fascicle is presented here because of its literary, technical and historic worth. The 1st fascicle has already been published.

Keywords: Precious Stones, Muhammad Bin Ahmed Alberuni, Gemmology, Physical chemestry.